عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

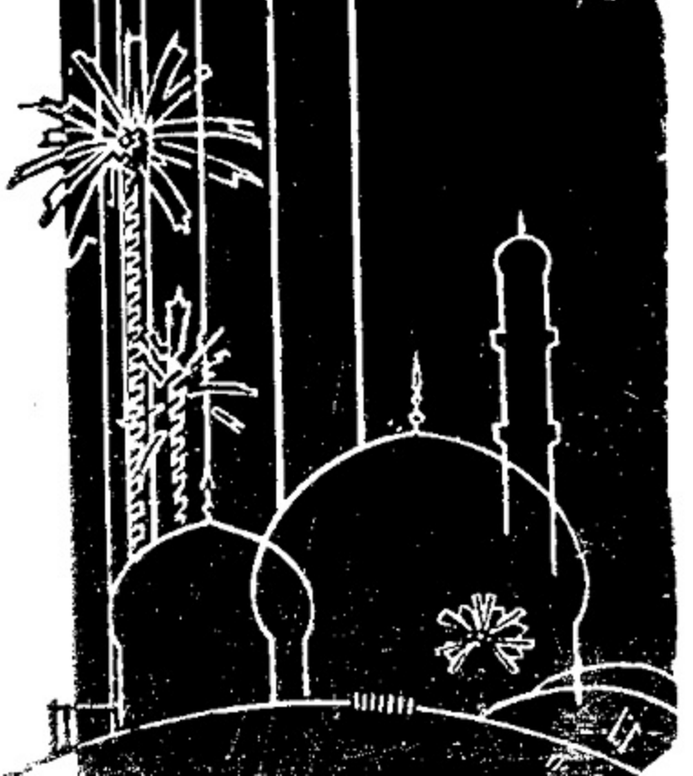

مارچ 1939

یادگار نمبر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب

محمد ظہیر الدین صدیقی بی ایس سی

بدل اشتراک

پانچ روپیہ سالانہ

فی پرچہ آٹھ آنہ

جلد (۲) شمارہ ۱۱

محرم الحرام ۱۳۵۸ھ بابتہ مارچ ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱- لمعات	ادارہ	۳، ۱۲
۲- اجلاس جمعیتہ علماء ہند		۱۳، ۲۰
۳- تہذیبی نقشہ ہندوستان		۲۱، ۲۴
۴- ہندوستان کا تہذیبی مستقبل	ڈاکٹر عبداللطیف صاحب (حیدرآباد)	۲۵، ۴۲
۵- خطبہ صدارت	حضرت علامہ اقبال رح	۴۳، ۷۷
۶- حیات آفریں شہادت (نظم)	جناب اسد ملتانی	۷۸
۷- عرضداشت بخدمت علماء کرام	ادارہ	۷۹، ۱۰۲
۸- ہندوستانی کیا ہے	محمد اکرم خانصاحب مدیر روزنامہ شمس	۱۰۱ ۱۰۸

لمعات

کسی مُرغابی کو پانی سے نکال کر فرشِ مخمل پر کھلا چھوڑ دیجیے، اور کھانے کے لیے مشک و عنبر کے عمدہ مرکبات دیجیے، وہ اس غیر فطری زندگی میں کبھی آزادی محسوس نہیں کریگی، اوج فلک پر اڑنے والے پرندے کو ایک سنہری قفس میں بند کر کے انگور اور رُمان کا دانہ ڈالیے وہ کبھی اطمینان کا سانس نہ لے گا شیرِ نیستاں کو باغِ حیوانات کے کسی کھُلے احاطے میں رکھیے اور بہترین قسم کا تازہ گوشت بلا محنت و مشقت کھانے کو دیجیے، وہ اس زندگی میں در و دیوار سے سر پھوڑتا نظر آئے گا۔ آئینِ فطرت ہمیں بتا رہے ہیں کہ آسودگی اور دلجمعی کی زندگی صرف پیٹ بھر کر کھانے کو ملجانا نہیں بلکہ اس فضا میں سانس لینا ہے جو فضا کسی کی فطرت کے مطابق ہو۔ شیرِ جنگل کی بھوک اور حصُولِ رزق کی خاطر زہرہ گداز جد و جہد کو باغِ حیوانات کی بلا مشقت سیر شکمی پر ہزار جان سے ترجیح دیگا، شہباز فضائے آسمانی کی جگر سوز تگ و تاز کے بدلے قفس کی سہل الحصُول روزی کو کبھی قبُول نہ کریگا، مُرغابی پانی کو چھوڑ کر حریر و اطلس کے فرش پر رہنا بھی پسند نہ کرے گی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عرصہ کی غلامی سے طبیعت قفس کی زندگی کی خوگر ہو جائے۔ اور حصول رزق ہی زندگی کا نصب العین سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ زندگی بہرنوع غیر فطری زندگی ہوگی۔ فطری زندگی محض اس فضا کی زندگی ہو سکتی ہے جو فضا اُسکی فطرت کے سازگار ہو۔ اگر آپ اس محبوسِ قفس شہباز کی آرزوؤں کا جائزہ لیں جس کی فطرت ہنوز مسخ نہیں ہوئی تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسکی نگاہوں میں زندگی ان بسیط فضاؤں میں بال کشائی کا نام ہے جنہیں وہ قفس کی تیلیوں سے ہمہ تن چشم بنکر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سو اتفاق سے کوئی مُرغابی اور شہباز ایک ہی کابک میں بند کر دیے

جائیں ظاہر ہے کہ ان دونوں کی آزادی کا نظریہ جداگانہ ہوگا۔ انکا منتہائے نگاہ الگ الگ ہوگا ایک کی آرزو ہوگی کہ قفس کا دروازہ کھلے تو آسمان کی بلندیوں کی طرف اُڑکر چلا جائے، دوسرے کی تمنا ہوگی کہ موقع ملے تو جھٹ پانی کے حوض میں تیرنے لگے۔ اگر آپ چاہیں کہ ان دونوں کو ایک جیسی مراعات دیکر خوش کرلیں تو یہ ناممکن ہوگا پس اگر اُن کے مطالبات میں اختلاف ہے حقوق طلبی میں ہم آہنگی نہیں تو اس میں ترش رُوئی کی کوئی وجہ نہیں۔ طعنہ زنی کا کوئی موقع نہیں۔ اگر شہباز اس بات پر رضامند نہیں ہوتا کہ اُسے پنجرے سے نکال کر پانی کے حوض میں چھوڑ دیا جائے تو مرغابی کا یہ طعن کیسے حق بجانب ہوسکتا ہے کہ وہ غلام فطرت ہے قفس کی قید کو آزادی کی ہوا پر ترجیح دیتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اگر شہباز اس مُرغابی کو یہ سمجھانے کی کوشش بھی کرے۔ کہ وہ کیوں آزادی کے اس قسم کے مطالبہ میں مُرغابی کا ہم آہنگ نہیں ہوسکتا تو مُرغابی کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آسکے اسلئے کہ :۔

کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

اِن چھوٹی چھوٹی مثالوں کو سامنے رکھیئے اور پھر سیاست حاضرہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی پوزیشن کا مطالعہ کیجئے۔

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے۔ یعنی وہ انسان کے لیئے ایک ایسی فضا پیدا کرتا ہے جو اسکی فطرت کے عین مطابق ہوتی ہے، یہ فضا، اسلامی نظام یعنی حکومتِ الٰہی کے قیام سے پیدا ہوتی ہے ایک مردِ مومن کے لیئے اس فضا میں رہنا ایسا ہی فطری ہے۔ جیسا شہباز کے لیئے جوِ آسمانی کی کھلی ہوا یا مُرغابی کے لیئے پانی، دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں اس قسم کی فضا کو "اسلامی کلچر" کہا جائے گا جو دُنیا کی ہر فضا سے الگ اور ہر کلچر سے جُدا ہے اگر حالات کی نامساعدت سے کبھی ایسا وقت آجائے کہ یہ فضا مکدر ہوجائے تو مردِ مومن پر یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ یا تو اس فضا کو پھر سے سازگار بنائے اور اگر ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہ ہو تو کسی دوسری جگہ سازگار فضا کیطرف منتقل ہوجائے۔ فضائے نامساعد میں قناعت سے زندگی بسر کرنا اپنے آپ کو غیر فطری ماحول سے مانوس کرلینا۔ مومن کے لیئے کبھی جائز

نہیں ہوسکتا کہ یہ اس بات کی علامت ہوگا کہ اسکی فطرتِ صالحہ مسخ ہوچکی ہے جو شیر سرکس کے پنجرے میں اطمینان کی نیند سوگیا۔ یا بھیڑوں کے گلہ میں مل جل کر اپنے آپ کو بھیڑ سمجھنے لگ گیا۔ اسکا جسم تو شیر کا سا ہوگا شیر کی روح اسکے اندر باقی نہ ہوگی حضرت علامہؒ فرماتے ہیں ۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار ٭ با مزاجِ او بسازد روزگار ٭
گر نسازد با مزاجِ او جہاں ٭ می شود جنگ آزما با آسماں ٭
بر کند بُنیادِ موجودات را ٭ می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایّام را برہم زند چرخِ نیلی فام را برہم زند ٭
می کُند از قوتِ خود آشکار روزگارِ نو کہ باشد سازگار

دوسری جگہ خطیرۂ قدس سے مردِ مومن کے لیئے یہ پیغام حیات لاتے ہیں کہ :۔

در شکن آنرا کہ ناید سازگار ٭ از ضمیرِ خود دگر عالم بیار ٭
بندۂ آزاد را آید گراں ٭ زیستن اندر جہانِ دیگراں ٭

جہانِ نامساعد کا کیا حشر کرنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں :۔

گفتند۔ جہانِ ما آیا بتو می سازد؟ گفتم۔ کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن!!

فضائے ناسازگار کے ساتھ توافق و تطابق پیدا کرلینے۔ اس سے مانوس ہوجانے کے عجمی فلسفہ کے خلاف فرماتے ہیں :۔

حدیثِ بے خبران است "با زمانہ بساز" زمانہ با تو نسازد۔ تو با زمانہ ستیز!

ہاں تو مردِ مومن کے نزدیک آزادی صرف "رد عمل" نہیں ہے۔ بلکہ وہ فضائے سازگار ہے جو اسکی فطرت سے ہم آہنگ ہو۔

اب ہندوستان کی طرف آیئے۔ انگریزوں نے ایک علاقہ فتح کیا۔ اور اسکے باشندوں کو اپنے زیرِ نگیں کرلیا۔ اس علاقہ کا نام "ہندوستان" قرار پایا۔ یہی وجہ ہے کہ نیپال جغرافیائی حدود

کے اعتبار سے ہندوستان کے اندر ہے لیکن وہ "ہندوستان" میں شامل نہیں۔ اگر انگریز اسے، یا افغانستان کو بھی فتح کر لیتے تو یہ علاقے بھی ہندوستان میں شامل ہو جاتے۔ ہماری مثال کے مطابق یوں سمجھیے کہ اتفاق سے تین مُرغابیاں اور ایک شہباز ایک کابک میں محبوس ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان ہمصفیرانِ قفس کو احساس پیدا ہوا کہ قفس کی زندگی سے آزادی حاصل کرنی چاہیئے۔ سوال پیدا ہوا کہ آزادی سے اُن کی مُراد کیا ہے؟ تو فرض کر لیا گیا کہ چونکہ یہ سب ایک ہی قفس کے قیدی ہیں اسلیئے انکا نظریۂ آزادی بھی یکساں ہونا چاہیئے۔ مُرغابیوں نے کہہ دیا کہ اگر ہمیں ایک تالاب میں چھوڑ دیا جائے تو ہمارا مطالبہ پورا ہو جائے گا اور اپنے مطالبہ کے برسرِ حق ہونے کے لیئے دلیل یہ پیش کر دی کہ دیکھ لو یہ اکثریت کا فیصلہ ہے، اُصولِ جمہوریت کی رُو سے اسی فیصلہ کو قولِ ناطق سمجھنا چاہیئے شہباز اس سے متفق نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے کہ بھائی! میری فضا تم سے مختلف ہے۔ میرا جہان الگ ہے۔ تمہاری آزادی میری آزادی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اُسے طعن دیا جاتا ہے کہ تم آزادی چاہتے نہیں ہو! تم درپردہ صیاد سے ملے ہوئے ہو، اس سے کہا جاتا ہے کہ جب ہم اور تم ایک ہی قفس کے رہنے والے ہیں، قریب قریب ایک جیسے بال و پَر رکھتے ہیں۔ پھر تم اپنے آپ کو ہم سے الگ کیوں سمجھتے ہو! ہم تو تمہارے اندر کوئی ایسی نمایاں خصوصیت نہیں دیکھتے جس سے تم الگ سمجھے جا سکو اور وہ اپنے امتیازی خصائص سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، تو یا تو اس کی بات ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتی یا اس سے عمداً گریز کیا جاتا ہے۔ بہرحال بات یہیں آکر رُک جاتی ہے کہ زندانی قفس کی اکثریت آزادی مانگتی ہے تو۔ اور صیاد کچھ دینا چاہتا ہے تو۔۔۔ اس مفروضہ کے ماتحت کہ تمام ہمصفیرانِ قفس ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ اور کوئی نہیں سمجھتا کہ یہ غلط ہے، کیونکہ

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ہندوستان کی سیاست میں اُصولی اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ محض اشتراکِ قفس (وطن) کی بنا پر شہباز اور مرغابی کو ایک واحد قومیت (Single Nationality) کے اجزاء

تصور کر لیا جاتا ہے۔ اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ دونوں ایک جیسی فضا میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر سکتے ہیں، چونکہ یہ خشتِ اوّل ہی غلط رکھی جاتی ہے۔ اسلیئے اِسکے بعد جتنی دیوار اٹھتی ہے سب غلط ہوتی ہے، اِس بنیادی اساسی غلطی کی طرف سب سے پہلے دُنیائے اسلام کے اس عظیم المرتبت مفکر نے توجہ منعطف کرائی جسے ظاہر بین نگاہوں نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا۔ یوں تو حضرتِ علامہؒ ایک مُدّت سے اپنے کلام میں جابجا اِس حقیقتِ ثابتہ کیطرف اشارے کرتے رہتے تھے لیکن ۱۹۳۰ء کی مسلم لیگ (الہ آباد) کے خطبہ صدارت میں آپنے جامع اور مانع حیثیت سے مسلم و غیر مسلم کی اس فطری اور اساسی تفریق کا اعلان کیا اور کھُلے کھُلے الفاظ میں بتا دیا کہ ہندوستان کی سیاسی کش مکش کا حل اسکے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ نہایت کشادہ ظرفی سے مردانہ وار اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے اور ایک ایسی فضا پیدا کرنے کے لیئے جو مسلمان کی فطرت سے ہم آہنگ ہو ایک اسلامی ریاست کا وجود عمل میں لایا جائے۔ ہندوؤں کیطرف سے اِس نظریہ کی مخالفت کچھ تعجب انگیز نہ تھی۔ وہ "اسلام کی آزادی" کو کیوں خوشی کی نگاہ سے دیکھیں۔ لیکن خود مسلمانوں میں سے بھی بعض نے کوتاہ نگہی کے باعث اور بعض نے اپنی مصلحتوں کی خاطر اِس نظریہ کو محض ایک "شاعرانہ تخیل" قرار دیا۔ اور حقارت کی ہنسی سے اسکا استقبال کیا۔ لیکن ۹ سال کے اس قلیل عرصہ میں احوال و ظروف کی گوناگوں تبدیلیوں نے بتا دیا کہ اِس نظریہ کے سوا نہ تو ہندوستان کی سیاسی اشکال کا کوئی اور حل ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے لیئے صحیح اسلامی زندگی بسر کرنے کی کوئی اور صورت۔ ہندی سیاست کے "بحرِ ظلمات" میں جہاں قلب و نظر کی پریشانیوں کی وجہ سے ایسی تو بر تو تاریکیاں چھا رہی ہیں کہ کسی ناخدا کو ساحلِ مقصود کا صحیح نشان نہیں ملتا۔ حضرت علامہؒ کا محولہ بالا خطبۂ صدارت روشنی کے جگمگاتے مینار کیطرح سربلند نظر آتا ہے۔ چونکہ اب طلوعِ اسلام میں اِس نظریہ کے مختلف گوشوں کے متعلق اکثر و بیشتر ذکر آیا کریگا۔ اسلیئے ہم چاہتے ہیں کہ یہ خطبۂ صدارت، جو اس نظریہ کا سنگِ بُنیاد ہے قارئین کے سامنے آجائے۔ اِس غرض کے پیشِ نظر اشاعتِ حاضرہ میں خطبۂ مذکورہ شائع کرنے کا فخر حاصل کیا جاتا ہے

حضرت علامہؒ کے اس نظریہ نے قوم کے سامنے ایک واضح اور روشن نصب العین رکھ دیا۔ مفکر ہمیشہ اصول وضع کیا کرتے ہیں جنکی تفصیلات و جزئیات بعد میں طے ہوا کرتی ہیں، نظریۂ زیر بحث نے ذہنوں میں ارتعاش اور نگاہوں میں جلا پیدا کی تو اسکی عملی تفسیروں پر غور و فکر شروع ہوا چنانچہ اسکا اوّلیں ہیولیٰ تحریکِ پاکستان کی شکل میں سامنے آیا جسکا مفہوم یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں۔ پنجاب، کشمیر، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی ریاست میں تبدیل کر لیا جائے جہاں مسلمان خالص اسلامی فضا میں زندگی بسر کر سکیں، چودھری رحمت علی صاحب اس تحریک کے روح رواں ہیں جو آجکل انگلستان میں مقیم ہیں۔

اسکے بعد حال ہی میں، حیدر آباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اس نظریہ کی ایک اور عملی تفسیر متعین کی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ "پاکستان" کے ایک اسلامی منطقہ کے بجائے ہندوستان کے باقی مسلمانوں کے لیئے بھی مختلف اطراف ملک میں تین اور اسلامی منطقے قایم کئے جائیں یعنی کل ہندوستان کی تقسیم جغرافیائی یا موجودہ صوبائی حدود کے بجائے تہذیبی (Caltural) حدود کے ماتحت کیجائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اسکیم کو اپنے مضمون "ہندوستان کا تہذیبی مستقبل" میں واضح طور پر بیان کیا ہے، یہ مضمون بھی اشاعتِ زیرِ نظر میں بہ مسرت شائع کیا جا رہا ہے۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس نظریہ کے متعلق مختلف اربابِ فکر و نظر کے خیالات طلوع اسلام کے صفحات میں پیش کریں۔ اور جب اس مسئلہ کے مختلف گوشے نمایاں طور پر سامنے آجائیں تو اپنے تبصرہ کر کے ایک واضح اسکیم تجویز کرنے کی جرأت کریں، وما توفیقی الا باللہ۔ ایک چیز ہوتی ہے، نصب العین یا مطمح نگاہ اور دوسری چیز اس نصب العین تک پہنچنے کے لیئے تدریجی مراحل اور ان مراحل کو طے کرنے کے لیئے عملی وسائل، نصب العین مسلمانوں کے سامنے ہے اور اسکے بہترین ہونے میں کسی صائب الرائے مدبر کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ تدریجی مراحل اور عملی وسائل کی جزئیات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان اختلافات کی چھان بین کرنے کے بعد ایک متفقہ علیہ راستہ اور ایک متحدہ نظام عمل تجویز کر لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ طریق کار جس پر اب ملتِ اسلامیہ کے تمام

بہی خواہان کی توجہات مرکوز ہونی چاہئیں، باقی رہے وہ حضرات جو شہبازاور مرغابی کے فطری امتیازات سے دانستہ یا نادانستہ آنکھیں بند کرکے محض "روٹی" ملجانے کا نام آزادی رکھتے ہیں، وہ چونکہ اسلام کی روح سے ناآشنا ہیں، یا اگر آشنا ہیں تو اُسکے اعلان کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے تو ایسے حضرات ہر دَور میں رہے ہیں اور رہیں گے، ملّتِ اسلامیہ کو ان کی طرف سے متردّد ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

اسے کیا غم کہ اس کی آستیں میں ہے یدِ بیضا

دُنیا میں کسی فریقِ مخالف کی ضِد توڑنے کے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اسے دلائل و براہین سے اپنا ہم خیال بنانیکی کوشش کیجائے۔ امرِ متنازعہ فیہ کے مختلف گوشوں پر علم و بصیرت کی روشنی میں بحث کیجائے۔ اور یوں دوسرے کے دل و دماغ میں سچائی کے اُصول کو پیوست کیا جائے۔ اسکی فطرتِ صالحہ اور عقلِ سلیم سے اپیل کی جائے اور اسے حق و انصاف کے مسلک کی دعوت دی جائے۔ لیکن اگر معاملہ اِس حد سے تجاوز کرچکا ہو تو پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اُسے قوت کے دباؤ سے سیدھا کیا جائے پہلا طریقہ صلح و آشتی، نرمی اور اہمسا کا طریقہ کہلاتا ہے۔ اور دوسرا تشدد اور ہمسا کا، مہاتما گاندھی اپنی زندگی کا نصب العین "سچائی اور اہمسا" قرار دیتے ہیں اور انہیں دُنیا میں اہمسا کے اوتار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے لیکن اگر واقعات کا ذرا گہری نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اِس دعوے کی حقیقت کیا ہے۔ اُن کی زندگی کے گزشتہ واقعات کو چھوڑیئے اور ایک تازہ ترین واقعہ کو لیجئے ریاست راجکوٹ کے ٹھاکر صاحب سے انہیں اختلاف پیدا ہوا۔ اِن کی طرف سے جو مطالبات پیش کئے گئے ٹھاکر صاحب انہیں منظور کرنے پر آمادہ نہ تھے، باہمی افہام و تفہیم سے کوشش کی گئی کہ ٹھاکر صاحب اپنی "ضد" چھوڑ دیں۔ لیکن اِس میں کامیابی نہ ہوئی یعنی صلح و آشتی، عدم تشدد اور اہمسا کے حربے ناکام رہے اَب اِسکے بعد وہی حربہ جسے قوت کا دباؤ کہتے ہیں! قوم میں چونکہ تنظیم پیدا ہوچکی ہے۔ اِس لیئے ان کی ہر اسکیم منظم طور پر چلائی جاتی ہے۔ مہاتما جی امن و سلامتی کے پیام بَر کی حیثیت سے راجکوٹ تشریف

لے گئے، باہر تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ اور مہاتما جی نے برت کا اعلان کر دیا۔ اُدھر یہ برت شروع ہوا اور ادھر ملک کے طول و عرض میں پروپیگنڈا سے ایک آگ بھڑکا دی گئی۔ ایسوشی ایٹڈ پریس کی خدمات تو ان اغراض کے لیے ہمیشہ سے وقف ہوتی ہیں تمام اخبارات میں بڑے بڑے جلی حروف سے زلزلہ انگیز اور قیامت خیز خبروں کا تانتا بندھ گیا کہ یوپی کے وزراء نے اپنے دورے منسوخ کر دیے ہیں اور لکھنؤ واپس آ رہے ہیں۔ بمبئی کے وزراء مستعفی ہو جانے کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ تمام کاروبار معلق ہو گئے ہیں اہم تقاریب ملتوی کر دی گئی ہیں، ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ وائسرائے صاحب کو تار پر تار دیئے جا رہے ہیں کہ حالات نازک ہیں فوراً مداخلت کیجئے اور معاملہ کو سلجھایئے۔ اگر مہاتما جی کی جان نازک کو ذرا سا بھی دھچکا لگ گیا تو ملک میں حشر برپا ہو جائیگا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر ہوائی جہازوں پر اُڑ کر راجکوٹ پہونچ رہے ہیں۔ بلٹن شائع ہو رہے ہیں کہ مہاتما جی میں اب اتنی قوتِ مدافعت نہیں ہے کہ وہ اس "صدمۂ جانکاہ" کو برداشت کر سکیں، انکے خون کا دباؤ اتنا ہے نبض کی رفتار یہ ہے صبح وزن اتنا تھا۔ شام کو اتنا رہ گیا۔ اختلاجِ قلب شروع ہو گیا۔ حالات تشویش انگیز ہیں۔ غرضیکہ ایک ہی دن میں تمام ملک میں بھونچال آ گیا، اور فضا میں ایسی کڑک اور گرج پیدا کی کہ خواہ مخواہ انسان کا دل دھڑکنے لگ جائے۔ یہ ہے وہ اہمسا جسکے ذریعہ سے ساری دنیا کو بچارے ٹھاکر صاحب کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے اور ایسی حالت پیدا کر دی جاتی ہے کہ اچھے بھلے آدمی کے اوسان خطا ہو جائیں اور وہ اس "خونِ ناحق" کے کفارہ سے ڈاکٹر سب کچھ دینے پر رضامند ہو جائے۔ باہر یہ تماشا ہو رہا ہے اور راجکوٹ کے اندر۔ امن و سلامتی کے شاہزادے۔ تشدد اور قوت کے استعمال کے دشمن۔ اہمسا کے اوتار، دیوتا سروپ مہاتما جی اپنے چیلوں کو سکھشا دے رہے ہیں کہ دیکھنا ٹھاکر صاحب پر کوئی ناجائز دباؤ نہ ڈالنا۔ میرا منشا تو اس برت سے صرف اتنا ہے کہ یہاں کی سیاسی فضا کو پوتر کر دوں۔ میں کسی سے بزور کچھ نہیں منوانا چاہتا۔ کسی پر جبر کرنا ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔

ہمیں نہ راجکوٹ کی ریاست سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی مہاتما جی کے برت سے کوئی تعلق۔ لیکن ہم انسانیت کا واسطہ دے کر صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کسی سے اپنے مطالبات

منوانے کی خاطر اِس حربہ کو اختیار کرنے میں اور اُسکے سر پر تلوار لیکر کھڑے ہو جانے میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق ہے؟ طاقت کے دباؤ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں کبھی یہ توپ اور بارود شمشیر وسناں کے سچ مچ کے استعمال میں جلوہ گر ہوتا ہے، جیسے مسولینی نے حبشہ کی تسخیر میں کیا۔ اور کبھی یہ ہٹلر کی اس دھمکی کی صورت میں گرجتا ہے جو آسٹریا یا سڈوٹن لینڈ کے قبضہ کے وقت دی گئی اور جس سے جناب چیمبرلین اسوقت تک تھرتھرا رہے ہیں۔ اگر ہٹلر کے اِس طریق کار کو اہمسا نہیں کہا جا سکتا تو فرمایئے کہ مہاتما جی کا ٹھاکر صاحب پر دباؤ ڈالنے کا یہ انداز کس طرح اہمسا کہلا سکتا ہے! اور اگر اِن دونوں میں کوئی فرق نہیں تو کیا یہ ایک کھُلا ہوا دھوکا نہیں جس میں لوگ اپنے آپ کو بھی مبتلا رکھتے ہیں اور دوسروں کو مبتلا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خداوندا یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

سچ ہے! جو اُصولِ زندگی ضابطۂ خداوندی کے ماتحت اختیار نہ کیا جائے اس میں ایسے ہی کچھ کھیل کھیلنے پڑتے ہیں، اگر مہاتما جی کے سامنے کہیں قرآنِ کریم ہوتا تو اُن کی سیاسی زندگی آج کی سطح سے کہیں بلند ہوتی اور اُن کو اس قسم کے حربوں کی کبھی ضرورت نہ پڑتی کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کے داعیات کو مختلف حیلوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔

پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ جب کوئی دوسرا آدمی اس قسم کی فاقہ کشی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو مہاتما جی اسے فوراً روک دیتے ہیں، چنانچہ اِس برت کے وقت بھی اُنہوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ کوئی شخص میری تقلید میں برت رکھنا شروع نہ کر دے۔ کیونکہ میں اس فن میں مشاق ہو چکا ہوں

Skilled in this art

Statesman 3.3.39

(اسٹیٹسمین ۳-۳-۳۹) مطلب واضح ہے۔ یعنی یہ برت اور فاقہ کشی بجائے خویش کوئی نتیجہ خیز عمل تو ہے نہیں اسکے نتائج تو اُس دباؤ سے مرتب ہوتے ہیں جو باہر کی دُنیا سے فریق مخالف پر ڈالا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دباؤ اسی صورت میں پڑ سکتا ہے جب فاقہ کرنیوالے کی شخصیت مہاتما گاندھی جیسی ہو۔ اگر کسی عام آدمی نے برت رکھ لیا۔ اور یوں اپنی جان

بھی دیدی تو اس سے کیا حاصل ہوگا! کون اسکی خاطر اتنا پروپگنڈا کریگا اور کون اسکی جان کی پرواہ کرے گا ؟

باقی رہا اس فن میں مشاقی کا معاملہ اور آتما شکتی (روحانی قوت) کا سوال تو اسکے لئے ہمیں تذکرہ صوفیہ کا ایک واقعہ یاد آگیا! اسمیں لکھا ہے ایک بزرگ کسی غار میں رہتے تھے، سال میں ایک دن ایسا ہوتا تھا کہ اس غار سے متصل جو شہر آباد تھا۔ وہاں کے لوگ اُن کے لیئے اچھے اچھے کھانے پکا کر لے جاتے تھے، وہ غار سے نکلکر اُنپر ایک نظر ڈالتے ہوئے چلے جاتے۔ اور کسی کا لایا ہوا کھانا نہ قبول کرتے اور نہ کچھ کھاتے پیتے۔

ایک حقیقت شناس نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اُس کو معلوم ہوا کہ یہ نفسیاتی جذبہ ہے جسنے اس تاریخ کو جس میں آبادی کے لوگ کھانے لیجایا کرتے تھے۔ سب لوگوں کو اس سے روک دیا اور کہا کہ تم سب خالی ہاتھ میرے ساتھ چلو، حسب معمول وہ بزرگ جب غار سے نکلے اور انہوں نے کوئی کھانے کی چیز کسی کے ہاتھ میں نہ دیکھی تو اُن کو اسقدر احساس ہوا کہ اسی روز انتقال کر گئے ۔

یہ واقعہ ہو یا تمثیل لیکن اِس نفسیاتی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قوت اپنے اندر کی اتنی نہیں ہوتی جتنی باہر کی دُنیا کی عقیدت و پرستش کی رہین منّت ہوتی ہے اور پھر انتظامات کا کیا ٹھکانہ! بے چارے ٹھاکر صاحب کی شادی میں اتنا صرف نہ ہوا ہوگا جتنا مہاتما جی کے ایک برت میں خرچ آجاتا ہے ۔

آل انڈیا ریڈیو میں زبان اُردو کو جس اُلٹی چھری سے آج کل ذبح کیا جارہا ہے وہ منظر اب اِس حد سے گزر چکا ہے ایک قلبِ حساس اُسے دیکھے اور خاموش گزر جائے۔ اس سے پیشتر تو خیر افسانوں اور ڈراموں ہی میں پرنتو اور ادِستا براجمان ہوتے تھے لیکن اب تو قیامت یہ ہے کہ خبروں کے حصہ میں، جسکے لیئے لوگ دن بھر ہمہ تن گوش منتظر رہتے ہیں۔ سوتنترا اور دِشا کی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ اکثر اوقات مطلب ہی خبط ہو جاتا ہے، ہماری سمجھ میں تو آج تک نہیں آیا کہ بالآخر ریڈیو والوں کو اس مذاق کی

سوجھی کیا ہے۔ ہم اس محکمہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس زبان کو دیکھے جس میں وہ ایک ہی سال اُدھر خبریں نشر کیا کرتے تھے اور بتائے کہ اس میں بھی کہیں اس قسم کے غیر مانوس الفاظ نظر آتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر بتائے کہ وہ کون سی ضرورت لاحق ہوئی کہ اچھی بھلی زبان کو یوں بگاڑنا شروع کر دیا؟۔

لیکن ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ارباب حکومت کے کان اس طرح نہیں کھلا کرتے۔ اسلئے ہم ان ریڈیو سننے والے مسلمان حضرات سے درخواست کرینگے جو یہ احساس رکھتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ کسقدر اہم ہے کہ وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی۔ کو اس قسم کی نامانوس زبان کے خلاف شکایات لکھ کر بھیجیں اور اگر وہ پھر بھی التفات نہ کریں تو بطور احتجاج اپنے ریڈیو بند کرا دیں، اور لائسنس کی تجدید نہ کرائیں۔

اواخر فروری میں دہلی اسٹیشن سے چھ تقریریں نشر ہوئیں جنکا عنوان تھا "ہندوستانی کیا ہے" ان تقاریر پر ایک مختصر سا تبصرہ رسالہ زیرِ نظر میں شائع ہو رہا ہے ہم صاحبِ مضمون کی اس تجویز کی تائید کرتے ہیں کہ اگر ریڈیو والوں پر کوئی ایسی ہی مصیبت آپڑی ہے کہ وہ لپکن اور صرق کے سے "غیر مانوس" الفاظ کے بجائے پرنتو اور کیول کے سے "مانوس" الفاظ کے بغیر نہیں رہ سکتے تو وہ جس طرح انگریزی میں جداگانہ وقت میں خبریں نشر کرتے ہیں۔ ہندی اور اُردو میں بھی الگ الگ اوقات میں خبریں نشر کیا کریں۔

معذرت

طلوع اسلام کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ رسالہ کچھ دنوں کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے یہ تاخیر کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر دانستہ روا رکھی گئی تھی آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ۳ لغایتہ ۵ مارچ دہلی میں جمعیتہ العلماء ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا آٹھ نو برس کے توقف کے بعد یہ اجلاس ایسے نازک دور میں منعقد ہو رہا تھا کہ اسکی اہمیت بالکل واضح تھی۔ طلوع اسلام ٹھیک یکم کو شائع ہو جاتا ہے، اگر یہ پرچہ بھی یکم کو شائع کر دیا جاتا تو اسکے معنی یہ تھے کہ ہم دہلی میں بیٹھے ہوئے اس اہم اجلاس کے متعلق ایک مہینہ کے بعد اپنے تاثرات

قارئین تک پہونچا سکتے۔ لہٰذا ہم نے دل پر جبر کرکے، اپنے اصول کو توڑا اور رسالہ کی اشاعت کو قصداً روک لیا۔ ہم چاہتے تھے کہ اعلائے کلمۃ الحق کے جس فریضہ کو لیکر طلوع اسلام نمودار ہوا ہے اسکی اتمام حجت ضرور ہو جائے۔ چنانچہ وہ مضمون جو بہ عنوان "عرضداشت بخدمت علمائے کرام" رسالہ میں شائع ہو رہا ہے ایک بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ پمفلٹ کی شکل میں شائع کرکے جلسے کے پہلے دن خاص اہتمام سے مفت تقسیم کرایا گیا۔ مضمون کے مطالعہ کے بعد آپ خود اندازہ فرمالیں گے کہ اس پمفلٹ کی اشاعت کس قدر بروقت اور برمحل تھی۔ اسکے بعد اجلاس کے متعلق ہمارا عمومی تبصرہ بھی رسالہ میں شائع ہو رہا ہے اسکے لیے بھی کچھ وقت درکار تھا۔ یہ تھے وہ اسباب جنکے ماتحت رسالہ کی اشاعت میں تاخیر کردی گئی لیکن اتنے دنوں قارئین کی طرف سے رسالہ نہ پہونچنے کے متعلق جو شکایات موصول ہوئیں وہ اس امر کی آئینہ دار ہیں کہ رسالہ کا کس شوق اور اضطراب سے انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ امر ہمارے لیے مسرت کا باعث ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہم قارئین طلوع اسلام سے اُن کی اس ذہنی کاوش اور روحانی خلش کے لیے بدل معذرت خواہ ہیں جو تاخیر اشاعت کیوجہ سے انہیں ہوئی اور آئندہ کے لیے وعدہ کرتے ہیں کہ انشاء اللہ اسکا اعادہ نہ ہوگا۔ اِلّا کوئی ایسی اہم ضرورت ہی پیش نہ آجائے ۔ وما توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم ۔

رُباعی

دُنیا تیرے کھنڈرات میں کیا کیا دیکھا
اقوام کا بَن بَن کے بگڑنا دیکھا
پتھرائی ہوئی آنکھیں ہوس کی دیکھیں
بندوں کی خُدائی کو سسکتا دیکھا

(جگر مراد آبادی)

جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس دہلی

حسب اعلان ۳-۴-۵ مارچ کو جمعیۃ العلماء ہند کا گیارھواں سالانہ اجلاس جامع مسجد کے سامنے پریڈ گراؤنڈ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی کارروائی پر مفصل تبصرہ کے لئے تو نہ وقت ہے نہ گنجائش۔ اس لئے ہم سردست اس کے بعض اہم گوشوں پر طائرانہ نگاہ ڈالیں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو تفصیلی باتیں بعد میں آتی رہیں گی۔

یوں تو دہلی میں دینیاتی مدارس کی کافی تعداد ہے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کے ایک ہزار طلباء کو بھی اس اجتماع میں شریک ہونے کے لئے دہلی لایا گیا۔ ۲ مارچ کی شام ان طالب علموں کا جلوس نکالا گیا۔ آگے آگے بگل بج رہا تھا۔ اس کے پیچھے کانگریس کا ترنگا جھنڈا تھا جس کے ایک گوشے میں سبز زمین پر سرخ ہلال کا نشان تھا جو بزبان حال پکار کر کہہ رہا تھا کہ متحدہ قومیت میں مذہب بے چارہ کس طرح دبک کر ایک کونے میں بیٹھا ہوگا۔ جلی حروف میں ایک ماٹو تھا کہ انگریز کی دوستی سے اسلام باقی نہیں رہتا۔ متجسس نگاہیں ڈھونڈھتی تھیں کہ اسی قسم کا فتوے ہندو کی دوستی کے متعلق بھی کہیں مل جائے لیکن یہ تلاش ناکام رہی۔ ہم تو قرآن کریم کی تعلیم سے یہی کچھ سمجھ سکے ہیں کہ جو فتوے انگریز کی دوستی کے متعلق ہے وہی ہندو کی دوستی کے متعلق بھی ہے۔ لیکن انگریز کی دوستی کو کفر اور ہندو کی دوستی کو اسلام قرار دینا یومنون ببعض الکتاب ویکفرون ببعض (قرآن کریم کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے سے انکار) کی ایک واضح اور بیّن مثال ہے۔ بیچارے طالب علموں کو کیا علم کہ جو کچھ ان سے کہلوایا جا رہا ہے اس کا مفہوم کیا ہے!

---

۳ مارچ کو بعد دوپہر پہلا اجلاس شروع ہوا جس میں صدر استقبالیہ کمیٹی جناب ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ انصاری نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ گرمجوشی کے ان مضطرب جذبات کا آئینہ دار تھا جو آج کل ڈاکٹر اشرف صاحب جیسے نوجوانوں کے سینوں میں موجزن نظر آتے ہیں۔ خطبہ میں یہ چیز بڑے کام کی کہی گئی کہ علماء حضرات کو

چاہیئے کہ عصر حاضرہ کی ضروریات اور موجودہ زمانہ کے داعیات کو سامنے رکھ کر قوم کے سیاسی ۔معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا حل دریافت کریں ۔لیکن اس تشبیب کے بعد گریز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا حل سوشلزم کے اندر مضمر ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس چیز کو وہ قوم کے لئے بہتر سمجھے قوم کے سامنے پیش کردے ۔لیکن یہ طریق کار تو کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہوسکتا کہ اپنے مسلک کو پیش کرتے ہوئے جس چیز کی مخالفت کا ڈر ہو اُسے صحیح رنگ میں پیش نہ کیا جائے ۔ یہ اجتماع اہل مذہب حضرات کا تھا اس لئے اس میں یہ فرمایا گیا کہ

"سوشلسٹ کی مذہبی پالیسی کے متعلق اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ وہ آپ کے مذہبی عقائد اور دینی اعمال سے کوئی تعارض نہیں کرنا چاہتے "

حیرت ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب نے اتنے بھرے مجمع میں ایسے خلاف حقیقت اعلان کی جرات کس طرح فرمائی ہم انشاء اللہ کسی قریبی فرصت میں گذارش کریں گے کہ سوشلزم کی بنیاد ہی خدا اور مذہب کے خلاف بغاوت کے جذبات پر رکھی گئی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان دو صورتوں سے خالی نہیں ۔یا تو وہ خود سوشلزم کے اصول ومبانی سے کماحقہٗ واقف نہیں ہیں اگر ایسا ہے تو اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے یا اُنہوں نے یہ سمجھ کر کہ مخاطب طبقہٗ علماء ہیں کون مغربی علوم سے واقف ہے ۔ (خدا نکردہ) دانستہ یہ غلط بیانی کی ہے اگر یہ شکل ہے تو

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے

ایک بات بڑی دلچسپ تھی ۔ ہمارے وہی علماء کرام جو آئے دن مسٹر جناح کو اس لئے گردن زدنی اور سوختنی قرار دیتے رہتے ہیں کہ وہ ڈاڑھی منڈاتے ہیں ۔ جھوم جھوم کر ڈاکٹر صاحب کا خطبہ سن رہے تھے ۔جن کی خود ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی اور سلاطین جابر کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق کے مدعیوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ پڑتی تھی کہ اپنے میزبان کی اس غیر شرعی صورت کے خلاف ایک حرف بھی زبان تک لا سکے ۔

صدر جلسہ ۔مولانا عبدالحق صاحب مدنی کا خطبۂ صدارت ان کیفیات کا مظہر تھا جو انسان کے دل میں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب اسے کسی مسلک کے غلط ہونے کا احساس تو ہو جائے لیکن اسکے کھلم کھلا اعتراف

ہیں ہنوز تذبذب ہو اور اس سے کچھ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ

دینا وہ اس کا ساغرِ مئے یاد ہے نظامؔ

منہ موڑ کر اُدھر کو - اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

مثلاً ایک طرف آپ کا ارشاد تھا کہ آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ "ہمارا مذہب آزاد ہو ضمیر آزاد ہو۔ زبان آزاد ہو معاشرت آزاد ہو" کیونکہ "مسلمان جہاں بھی ہو وہ رب قدیر کی جانب سے ایک خاص قانون کا مکلف ہے جو اس کی اجتماعی وانفرادی حیات کا متکفل ہے اور اس کی ہر ایک حیثیت کا محافظ" لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد تھا کہ "مسلمان، ہندوستانی قومیت (نیشنلزم) کا اہم جزو ہے"۔ یہ بھی فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کی الگ تنظیم ہو۔ ان کا اپنا نظام ہو، اپنی مرکزیت ہو۔ تمام صوبوں سے امیر منتخب ہوں۔ اور پھر تمام ہندوستان کا ایک امیر اعظم ہو" لیکن اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو اس قسم کی اجتماعیت، مرکزیت اور تنظیم کو ہی صحیح اسلامی مسلک قرار دیتے ہیں۔ انگریز کا غلام، آزادی کا دشمن بھی قرار دیا گیا تھا۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ "ہمارا مذہبی اور معاشرتی نظام ایک مستقل اور خود مختار (کلچرل اٹانمی) ہو" کیونکہ "ہندوستان کی تمام قوموں میں مسلمانان ہند کی ایک ایسی قوم ہے جو بلاشبہ ایک مخصوص کلچر رکھتی ہے" اور دوسری طرف "متحدہ قومیت" کی تشکیل کا بھی مشورہ تھا۔ یہ بھی اعتراف تھا کہ "بے شک عام ہندو ذہنیت بھی وطن پرست نہیں اور انصاف یہ ہے کہ وہ اکثریت کے باوجود مسلمان سے زیادہ تنگ نظر واقع ہوئی ہے" اور دوسری طرف یہ بھی کہ "کانگریس کو ہندو جماعت قرار دے کر لعنتی قرار نہیں دینا چاہیئے"

اس اُلجھاؤ سے صاف ظاہر تھا کہ ان حضرات کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں کہ ہندی سیاست میں قومیت (نیشنلزم) کا مفہوم کیا ہے اور متحدہ قومیت کی تشکیل کس طرح عمل میں آتی ہے۔ ورنہ وہ ایسی کھلی ہوئی متضاد باتوں کو آپس میں کبھی نہ ملاتے۔ لیکن بہرحال شگون نیک ہیں۔ پہلا خیال اپنی جگہ سے ہل چکا ہے۔ صحیح علم کے بعد انشاءاللہ یہ حضرات بین بین کا راستہ چھوڑ کر صحیح مسلک پر بھی ضرور آجائیںگے۔

اور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

رات کو کھلا اجلاس ہوا لیکن ہفتہ کا تمام دن مجلس مضامین کے اجلاس ہوتے رہے۔ صرف رات کو کھلا جلسہ ہوا۔ معرکہ کا پروگرام اتوار کے دن تھا صبح مجلس مضامین کا جلسہ ہوا۔ اور سہ پہر سے کھلا اجلاس اس جلسہ میں وارد ہا کی تعلیمی اسکیم کے متعلق واضح الفاظ میں ریزولیشن پاس کیا گیا جس پر ہم ارباب جمعیت کو مستحق تبریک و تہنیت قرار دیتے ہیں۔ وارد ھا اسکیم کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے جمعیۃ نے ایک کمیٹی متعین کی تھی اس کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی۔ اور اس رپورٹ۔ نیز اس کے بعد کی قرارداد میں حرف حرف ان نقائص کو بیان کیا گیا۔ جنہیں ہم اس سے بہت پہلے طلوع اسلام کے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم۔ بارہ برس کی لڑکی کو جبری تعلیم۔ موسیقی کی تعلیم، تصویر کشی کی تعلیم۔ ان سب کے خلاف احتجاج کیا گیا لیکن اس کا اہم ترین حصہ تو وہ ہے جسکے متعلق جناب ناظم صاحب (مولانا احمد سعید صاحب) نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جمعیت العلما کا یہ درخشندہ کارنامہ ہے کہ اس نے ان دو بنیادی خطرات کو گہرائیوں میں ڈوب کر نکالا ہے۔ جو اس اسکیم کے بہ ظاہر خوش آیند الفاظ کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ اور وہ خطرات یہ ہیں کہ اول اس تعلیم کی رو سے بچے کو ذہن نشین کرایا جائے گا کہ بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اور دوسرے اس اسکیم میں بچوں کو اہما کی تعلیم دی جائے گی۔ چنانچہ اُنہوں نے فرمایا کہ اگر کانگریس نے اس اسکیم سے ان تمام امور کو خارج نہ کیا تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ کانگریس کے خلاف سول نافرمانی شروع کر دیں۔

ہم کس زبان سے اس ذات باری تعالےٰ کے احسانات کا شکریہ ادا کریں کہ جس نے ہمیں یہ توفیق عطا فرمائی کہ آج سے آٹھ ماہ پیشتر (اگست ۱۹۳۸ء میں) جب کہ مسلمانوں میں سے کسی جماعت کی نگاہ اس اسکیم کی طرف نہیں اُٹھی تھی۔ طلوع اسلام نے لفظاً لفظاً ان اعتراضات کو اُبھار کر پیش کیا۔ اور ہر ایک مخالفت کو برداشت کرتے ہوئے ان اعتراضات کو بار بار دُھرایا۔ وارد ھا اسکیم کا پمفلٹ اٹھارہ ہزار کی تعداد میں صرف اُردو میں تقسیم کیا اور آج اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود قومیت پرست علماء کے پلیٹ فارم سے ان اعتراضات کی پُرزور تائید کی گئی فالحمدللہ علیٰ ذالک۔ معلوم نہیں ارباب جامعہ جنہوں نے ہمارے اعتراضات کے جواب میں ہمیں ضدی متعصب تنگ نظر اور جلد بھڑک اُٹھنے والے کہدینا ہی کافی سمجھ لیا تھا۔ اب خود اپنے کیمپ کے ان علماء حضرات کی شان میں کیا فرمائیں گے۔

ایک بات حضرات علمار کرام سے بھی دریافت طلب ہے۔ اُنہوں نے کھلے کھلے الفاظ میں اعلان فرمایا ہے کہ یہ عقیدہ کہ اسلام اور دیگر ادیان بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ باطل ہے اور اسلامی تعلیم کے یکسر خلاف۔ ان حضرات کو غالباً اس بات کا تو علم ہوگا کہ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں اس تعلیم کو پیش کیا ہے جس کی مخالفت جمعیۃ العلمائے کی ہے۔ اس کے متعلق طلوع اسلام کے شائع کردہ مضمون "واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان" میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔ نیز مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مشکلات القرآن" کے مقدمہ میں بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کتاب (یعنے ترجمان القرآن) کے متعلق حضرت علمار کرام کا کیا ارشاد ہے؟

اس جلسہ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ غلط ہے کہ ہم کانگریس کے اندر رہتے ہوئے کانگریس کے فیصلوں کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ ہم باادب گذارش کرینگے کہ یہ چیز اُصولاً غلط ہے کہ آپ ایک جماعت کے رکن بھی ہوں اور اس کے فیصلوں کی خلاف ورزی بھی کریں۔ کوئی جماعت ہو۔ اس کی رُکنیت کی شرط یہ ہوتی ہے کہ آپ اس کے قواعد وضوابط کو اچھی طرح سے دیکھ بھال لیں جب آپ ان سے متفق ہوں تو اس کے رُکن بن جائیں۔ اب اس کے بعد جب تک آپ اس کے رُکن رہیں گے آپ کو اس کے تمام فیصلوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر آپ ان کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس جماعت سے باہر آئیے۔ اس کی رکنیت سے مستعفی ہو جئے۔ اس کے بعد جو جی میں آئے کیجئے۔ یہ آئین ودستور کی ایک بنیادی شق ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ آپ کانگریس کے ممبر رہتے ہوئے تو اسکی کسی اسکیم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو وہ خود بخود آپ کو اس جماعت سے خارج کر دینگے۔

اس کے بعد کانگریس میں شرکت وعدم شرکت کا مسئلہ پیش ہوا۔ اس مقام پر جو کچھ سامنے آیا وہ فکر ونظر کی پریشانی کا ایک بیّن مظاہرہ تھا۔ ایک طرف اس چیز پر زور دیا جا رہا تھا کہ مسلمان اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی جداگانہ قومی ہستی کسی دوسری قوم میں جذب ہو کر فنا ہو جائے اور دوسری طرف مسلمانوں سے

کہا جارہا تھا کہ وہ بلا مشروط جوق در جوق کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ حیرت تھی کہ سیاست ہند کا یہ بنیادی اصول بھی ان حضرات کی نظروں سے اوجھل تھا کہ کانگریس میں بلا مشروط وہی شریک ہو سکتا ہے جو متحدہ قومیت (یعنے ہندوستان میں ایک واحد قومیت) کے اصول کو تسلیم کرلے۔ اور واحد قومیت کے معنے یہ ہیں کہ کسی جماعت کی جُداگانہ قومیت باقی نہ رہے۔ سب اپنی اپنی جُداگانہ قومی حیثیت فنا کرکے ایک بڑے کُل کا جزو بن جائیں۔ جب حالت یہ ہو تو پھر اپنی جُداگانہ قومی ہستی کو برقرار رکھتے ہوئے کانگریس میں شامل کیسے ہوا جا سکتا ہے؟ اس باب میں ہم ارباب جمعیت کی خدمت میں ایک بالکل واضح سی چیز پیش کرتے ہیں یعنی وہ کانگریس سے اتنا دریافت کریں کہ آیا کانگریس ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک جُداگانہ الگ قوم (نیشن) تسلیم کرتی ہے؟ جو کچھ وہاں سے جواب ملے اسے مع اپنے خط کے شائع فرمادیں۔ بات صاف ہو جائے گی! اپنے ہاں یہ کہتے رہنا کہ ہم ایک الگ قومی ہستی رکھتے ہیں اور کانگریس سے اپنی جُداگانہ قومیت تسلیم کرائے بغیر اس میں شریک ہو جانا یا تو سیاست حاضرہ کے اُصول و مبانی سے انتہائی ناواقفیت کی دلیل ہے اور یا (معاف فرمائیے) انتہائی خود فریبی کا ثبوت۔ بہرحال انتظار کرنا چاہیئے کہ اگر جمعیت العلمائے کے ارباب حل وعقد مذکورہ بالا تجویز کے مطابق کانگریس سے مسلمانوں کی جُداگانہ قومیت کے متعلق دریافت فرمائیں تو اس کا وہاں سے کیا جواب ملتا ہے! نیز یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ وارد ھا اسکیم کے متعلق جمعیت العلمائے نے جو اعلان کیا ہے کہ اگر اس کے قابل اعتراض اجزا کی ترمیم و اصلاح نہ کی گئی تو یہ کانگریس کے خلاف سول نافرمانی شروع کردیں گے۔ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے!!

ان اجلاس کے عمومی تاثرات یہ تھے کہ بالعموم ان حضرات علمائے کرام کو عصر حاضرہ کی سیاست سے محض سطحی سی واقفیت حاصل تھی اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مذہب کے نام پر عوام کے جذبات مشتعل کرکے ان کے دلوں میں اس چیز کو راسخ کردیا جائے کہ ہر معاملہ میں ان کی رائے قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔ ہمیں علما حضرات کا پورا پورا احترام ملحوظ ہے اور ہم خود چاہتے ہیں کہ انکی رائے فی الواقع ہر معاملہ میں قول فیصل کا حکم رکھے لیکن یہ بھی تو ضروری ہے کہ اصابت رائے کے لئے جن تجارب و مشاہدات اور علوم و فنون کی ضرورت ہے یہ حضرات ان سے بھی متمتع ہوں۔ آج ہندوستان میں آئینی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان تبدیلیوں کے

نتائج وعواقب کو کماحقہٗ سمجھنے کے لئے اس دستور وآئین کو پوری طرح سے سمجھا جائے جسکی بنا پر یہ تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ جب تک آپ آئین و دستور Constitution کو نہ سمجھیں گے۔ اس کے متعلق رائے کیا دے سکیں گے۔ لیکن جب حالت یہ ہو کہ تمام ہندوستان کے علماء کبار کے اس عدیم النظیر اجتماع میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے جس نے کم از کم گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ہی پڑھا ہو۔ تو فرمایئے کہ آئین و دستور کے متعلق ایسے اجتماع کے فیصلے کس قدر وقعیت کے ہو سکتے ہیں۔ علماء حضرات کی اسی کمی۔ اور پھر کمی کے متعلق ان کے عدمِ احساس نے ہی تو آج امت کو اس قدر مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اور دوسرے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اسی لئے تو کہا گیا تھا کہ

مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت
نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی (اقبال)

التماس

دفتر میں جون، جولائی، دسمبر اور جنوری کے پرچے ختم ہو گئے اور جو حضرات ان مہینوں کے بعد خریدار ہوئے ہیں ان کا اصرار ہے کہ شروع سے پرچے دیئے جائیں تاکہ اُن کا فائل مکمل ہو جائے اس لیئے اعلان کیا جاتا ہے جو صاحب مذکورۂ بالا مہینوں کے رسالہ دفتر میں بھیجدیں گے ۸ رنی کاپی کے حساب سے دفتر خرید لے گا۔

میجر

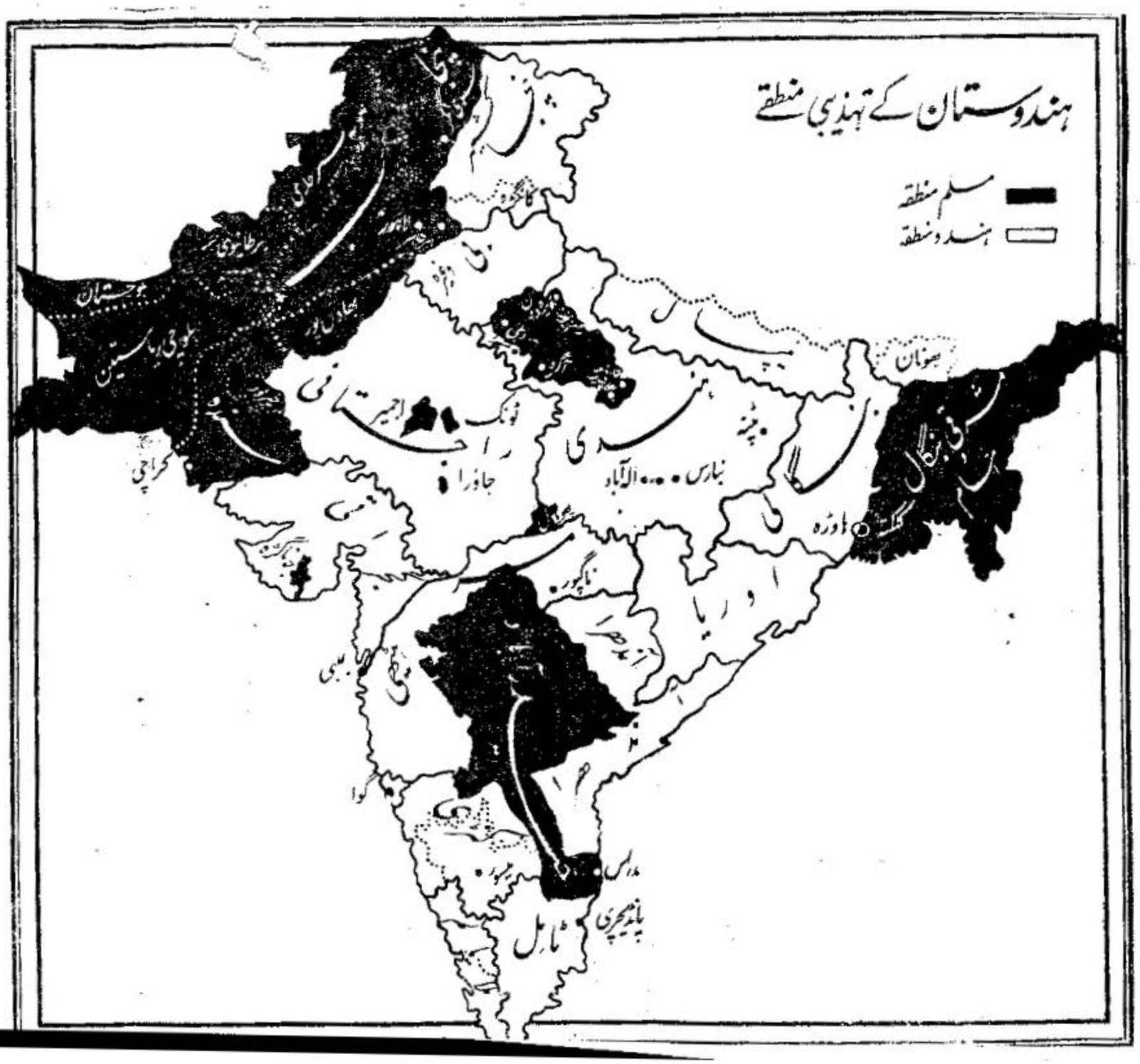

ہندوستان کے تہذیبی منطقے
مسلم منطقہ
ہندو منطقہ
کانگڑہ
بلوچستان
بلوچی ریاستیں
بہاول پور
کراچی
ٹونک
اجمیر
جاورا
پٹنہ
بنارس
الہ آباد
بھوٹان
ہاوڑہ
ناگپور
بمبئی
میسور
مدراس
پانڈیچری
تامل

Blank Page

Blank Page

Blank Page

ہندوستان کا تہذیبی مستقبل[1]

ہندو مسلم ملاپ کی گتھی سلجھنے میں نہیں آتی۔ اُسکے سلجھانے والے محض سیاسی لیڈر ہیں اور جب تک صرف سیاسی ناخن کارفرما ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ گتھی اُلجھی ہی رہیگی۔ ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر سیاسی پہلو کی بجائے، تہذیبی مسئلہ کی حیثیت سے — جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے نظر ڈالی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے اور واقعیت پسندانہ Realistie انداز میں ہو جائے تو پھر اس سے ملا جُلا ہر مسئلہ یہاں تک کہ سیاسی مسئلہ بھی سلجھ جائے گا۔

تہذیب (Culture) کا لفظ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں ذہنی، جمالیاتی، روحانی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی غرض ہر قسم کی انسانی جد و جہد شامل ہے۔ کیونکہ تہذیب کا سرچشمہ نفس انسانی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جیسا نفس (Mind) ہوگا، ویسے ہی اُسکے مظاہر ہونگے۔ جن سے تہذیب صورت پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا ہندوستان میں ایسا نفسِ واحد جنم لے سکتا ہے جو اس سرزمین کے مختلف طبقات کی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اپنے کو آشکارا کر سکے؟ یا یوں کہیئے کہ کیا ہندوستان ایک واحد قومیت پیدا کر سکتا ہے؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو کیا کوئی اور بُنیاد ہے۔ جس پر ایک ایسی وحدت قایم کیجا سکے جو مختلف طبقات کی تہذیبوں میں مستقل طور پر منعکس رہے؟

قومیت اس مسئلہ پر صحیح طور سے غور کرنیکے لیئے قومیت Nationalism کے ٹھیک ٹھیک مفہوم کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ انگریزی زبان کا شاید ہی کوئی اور لفظ ایسا ہو جسے ہمارے مُلک کے سیاست دانوں اسقدر غلط استعمال کیا ہے۔ کبھی لاعلمی کی وجہ سے مگر اکثر و بیشتر عوام کی نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھانے

---

[1] Cultural Future

کی غرض سے اس لفظ کا غلط استعمال روا رکھا جاتا ہے۔ اس لفظ میں کچھ ایسی دلفریبیاں ہیں کہ قریب قریب ہر تنظیم چاہے اُسکا مسلک کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو، اپنی ہر بات کو قومیت کے رنگ میں پیش کرنا سُود مند خیال کرتی ہے اسلئے سب سے پہلے اس لفظ کا حقیقی مفہوم ہمارے سامنے واضح ہونا چاہیئے۔

میرا منشا یہ نہیں ہے کہ اس لفظ کی وہ سب تعریفیں پیش کروں جو اب تک کی گئی ہیں۔ اور جو بجائے خود اتنی کثیر اور ایسی متضاد ہیں کہ ان سے جی گھبرا اُٹھتا ہے۔ مگر میں بہت مختصر طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ آپ قومیت کے تصور کو چاہے نسلی نقطۂ نظر سے دیکھیں یا لسانی، مذہبی، معاشی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے اسپر بحث کریں یا اسے کسی ایسے نظریے سے منطبق کریں جو یورپ یا کسی اور ملک کی سیاسی زندگی کے بعض نئے حالات سے وجود میں آیا ہو۔ آپ کو بہر صورت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اِن سب نظریوں کی تہ میں ایک ایسا مشترک عنصر موجود ہے جو اساسی اہمیت رکھتا ہے، اور جس کا ہونا کسی قوم کے وجود میں آنے یا اسکی تشکیل پانے کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ عنصر ایک مشترک اخلاقی شعور (Moral consciousness) ہے اسکی موجودگی اُن سب افراد کی زندگی میں ضروری ہے جو ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہنا چاہتے ہیں سوال یہ ہے کہ آیا کوئی ایسا مشترک اخلاقی شعور اس وقت ہندوستان میں موجود ہے؟ یا مستقبل قریب میں اُسکے پیدا ہونے کی کوئی اُمید ہے؟ یہ سوال سنجیدہ غور و فکر کا مقتضی ہے کیونکہ کسی اور بنیاد پر اس مُلک کے لئے ایک واحد قومیت کے وجود یا اُسکی تشکیل پر بحث کرنے کی جرأت ہی نہیں کیجا سکتی

اتحاد کے اجزا کا فقدان

نسلی اعتبار سے ہندوستان میں ہم جنسی نہیں ہے۔ وہ مختلف اور مخلوط نسلوں کا مجموعہ ہے یہ چیز واحد قومیت کی تشکیل میں حائل نہ ہوتی اگر اُسکے رہنے والے کم از کم تہذیبی اعتبار سے ایک ہوتے مگر ایسا بھی نہیں ہے بلکہ تہذیبوں سے قطع نظر یہاں دو بڑی تہذیبیں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ جن میں مختلف مذاہب کی روح کارفرما ہے اور جو افراد کی زندگی کے ہر پہلو پر گہرا اثر رکھتی ہیں یورپ یا ممالک متحدہ امریکہ کی تمثیل یہاں پوری نہیں اُترتی۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں کے مسلک (رومن کیتھولک اینگلیکن، پروٹسٹنٹ یونانی مسیحیت) سب ایک ہی سوتے سے نکلے ہیں اور کم و بیش ایک ہی

قسم کے اخلاقی شعور یعنی مسیحی شعور۔ کی پرورش کرتے ہیں۔ اور قومی جتھابندی کے راستہ میں حائل نہیں ہوتے۔

ہندوستان میں معاملہ برعکس ہے۔ اسلام اور ہندومت میں بُعدالمشرقین ہے وہ مختلف معاشرتی نظام کے ذمہ دار ہیں۔ اسلام ایسی جمہوریت کی تلقین کرتا ہے جو نوعِ انسان کو ایک کرنے کے لیے رنگ، نسل اور زبان کے اختلافات یا جغرافیائی حدبندیوں کو کالعدم کر دیتی ہے۔ ہندومت ذات پات کے جھمیلوں اور درجہ بندیوں کا نظام ہے اور اسکی رگ رگ میں علامت پرستی Symbolism رچی ہوئی ہے۔ ہندومت فی الحقیقت کوئی ایک مذہب نہیں ہے، وہ کئی مذہبوں یا تہذیبوں کا ایک وفاق Federation ہے وہ ایک سماجی استبداد ہے جو برہمنی رسوم کے ذریعہ ذہنی ارتقا کی ہر منزل پر اپنے پیرووں کو ایک آہنی گرفت میں رکھتا ہے وہ ایک معاشرتی نظام ہے، جس میں روحانیت یا فلسفہ یہانتک کہ ہر قسم کی نیکی بھی محض انفرادی کوشش ہوتی ہے جسکا پورے سماج کی روحانی یا اخلاقی ترقی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب صورت یہ ہے کہ نئی تعلیم اس برہمنی نظام کا شیرازہ بکھیر رہی ہے اور سیاسی بیداری کی موجیں جو لسانی صوبہ واریت (Linguistic provincialism) کے ڈھرّوں پر اُمڈی چلی آرہی ہیں۔ انھوں نے مرہٹہ۔ راجپوت، گجراتی، بنگالی اوڑیسہ، آندھرا، ملیالی، کنڑی اور تامل غرض نئے نئے نسلی اور تہذیبی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان قوتوں کے ہوتے ہوئے ایک واحد اور مستقل ہندو قومیت کی تشکیل کچھ آسان کام نہیں ہے۔ درانحالیکہ جنوبی ہند کی وہ عظیم الشان دراوڑی تہذیب جس کو صدیوں سے آریہ تہذیب نے سُلا رکھا تھا۔ اب بیداری کی کروٹ لیتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کونسا عنصر ہے جس کی مدد سے ہندوستان میں ایک ایسی قومیت بن سکتی ہے جو ہندو، مسلمان، عیسائی اور بدھ وغیرہ سب کو بغیر کسی امتیاز کے اپنے میں جذب کرلے مشترکہ زبان[1] شاید یہ کرسکتی تھی مگر اس کا بھی تو سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں

---

[1] اسلام میں اشتراکِ زبان بھی وجہ جامعیت نہیں ہوسکتا ورنہ ابوجہل اور حضرت عمرؓ کی زبان تو ایک ہی تھی (طلوع اسلام)

جہاں ایک طرف ہندؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی کش مکش جاری ہو۔ اور دوسری طرف لسانی صوبہ داریت کے داؤ پیچ چل رہے ہوں وہاں ایسی مشترکہ زبان جو ملک کے تمام باشندوں پر اثر انداز ہو کیسے پنپ سکتی ہے؟

ایک اور مشکل یہ ہے کہ واحد قومیت کے تصور کو جس فضا میں عملی جامہ پہنانے کی خواہش کی جاتی ہے وہ بڑی وسیع ہے، ہندوستان ایک ملک نہیں ہے وہ ایک براعظم ہے جسکا رقبہ روس کو چھوڑ کر سارے یورپ کے برابر ہے۔ ہندوستان کی موجودہ وحدت۔ سیاسی معاشی یا جس قسم کی سمجھو — اس برطانوی راج کا نتیجہ ہے جسکے مٹانے پر ایک مخلوق تلی ہوئی ہے

ہندوستان کے لیئے مشترکہ قومیت کا راگ الاپنا جبکہ قومیت کے جملہ عناصر ترکیبی مفقود ہوں بڑی ہٹ دھرمی ہے مشترکہ قومیت کا راگ اسی وقت بھلا معلوم ہو سکتا ہے۔ جب کوئی مشترکہ اخلاقی شعور موجود ہو یا اُسکے وجود میں آنے کا سچ مچ امکان ہو مشترکہ شعور کی موجودگی میں واحد قومیت کی داغ بیل پر کسی پروگرام کا بنانا واجبی بات ہے۔ لیکن اگر ایسا شعور موجود نہیں ہے یا اُسکا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے تو پھر ہمیں فراخدلی کے ساتھ اپنی کوتاہیاں تسلیم کر لینی چاہئیں اور ہندوستان کی وحدت کے منصوبے کو کسی اور بنیاد پر کھڑا کرنا چاہیئے۔

میں یہ باور کرنے کے تیار نہیں کہ ہندوستان کے لیئے مشترک قومیت کا دم بھرنے والے — کم از کم وہ جو اُن میں زیادہ باخبر ہیں۔ راستہ کی کٹھن مشکلوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اجنبی تسلط کے خلاف نفرت پھیلا کر سارے ملک میں ایک ہمہ گیر شعور پیدا کیا جا سکتا ہے جو لوگ اس عقیدہ کے دلدادہ ہیں انہیں یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ ہر ایسا شعور جو نفرت یا بیر سے پیدا ہو محض شکست و ریخت کا ایک غیر اثباتی جذبہ ہوگا۔ اور وہ اُن ایجابی (Positive) فضائل کو پیدا نہ کر سکے گا، جو اس مشترکہ اخلاقی شعور کے راستے کے دیرینہ اور مکروہ موانعات کو ہمیشہ کے لیئے دُور کر سکے جسپر صحیح قومیت کا انحصار ہوتا ہے یا جسپر حقیقی جمہوریت پھل پھول سکتی ہے، ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کو اپنی خاص بنیاد پر رہنا چاہیئے۔ اسے واحد قومیت کی تجویز کے ساتھ خلط ملط کرنا آزادی کی راہ میں

نئی رُکاوٹیں پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح کسی پنہاں مقصد کے حصول کے لیئے کارل مارکس کے مذہب گرسنگی Hunger creed کو مسلمانوں کے افلاس کا علاج قرار دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے یہ گویا زہر کو شکر میں لپیٹ کر دینا ہے۔ اگر انکی بھوک کو دُور کرنا ہے تو پھر اس ضرورت کو اسی نام سے پورا کرو۔ کیونکہ بھوک کوئی قومیّت نہیں رکھتی، واحد قومیت کے نظام العمل میں گرسنگی کے مذہب کو بہانا بنانا خطرناک راستہ ہے؛ کیا ہماری مختلف تہذیبی جبلّتیں (Cultural instincts) پیٹ بھرتے ہی دوبارہ اُبھر نہ آئیں گی۔ اور تشدّد آمیز ردِّ عمل کا باعث نہ ہوں گی؟

میں یہ کسی حال میں پسند نہ کرونگا کہ قومیت کے پروگرام کی بنیاد ان قوتوں پر رکھی جائے جو نفرت کی پیداوار ہوں۔ ایسی قوتیں دیرپا نہ ہوں گی اور انہیں ہماری سمجھ پر پردہ ڈالنے کا موقع نہ دینا چاہیئے۔ میری تمنا یہ ہے کہ ہندوستان کو ایسے بلند اور نیک مقصد کے لیئے متحد ہوتا دیکھوں جو آزادی کی خاطر آزادی کا ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرے جو اس دیس کے ہر سپوت کو مساواتی بنیاد پر آزادی عطا کرے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی امتیازی خصوصیتوں کی موجودگی میں واحد قومیت ممکن نہیں ہے، الا یہ کہ مسلمان اپنی تہذیب اور انفرادیت سے دست بردار ہو جائیں اور ہندوانہ معاشرتی نظام میں ذیلی ذات (Sub coste) کی حیثیت سے اپنے آپ کو اس طرح ضم کر دیں جس طرح بہت سے گروہ پہلے ضم ہو چکے ہیں، یا یہ کہ خود ہندو اپنی علامت پرستی کی زندگی اور ذات پات کے امتیازات کو ترک کر کے خالص توحیدی جمہوری زندگی میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ شریک ہو جائیں چونکہ ہندوستان کی موجودہ نسلوں سے ایسی اُمید رکھنا مشکل ہے اسلئے یہ فرض کرنا ہمارا فرض ہے کہ اس مُلک کی زندگی میں ایسا اتحاد کس طرح حاصل کیا جائے جو دیرپا ہو اور مُلک کے سامنے حقیقی آزادی اور خوش حالی کا راستہ کھول دے

کانگرس کا نصب العین

اگر ان حقایق اور موانعات کے باوجود واحد قومیت Single Nationality کی بنیاد پر کسی پروگرام پر اصرار کیا گیا تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ ہندو قومیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ اور یہ کہ دوسری قوموں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنی ہوگی ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ

نہ تو کانگریس کا پروگرام جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہے مسلمانوں کے لئے اپنے اندر کوئی دلکشی رکھتا ہے، اور نہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ جسکی آڑ میں کانگرس اپنا مطلب حاصل کرنے کی دُھن میں لگی ہوئی ہے۔

یہ ایکٹ ہر صُوبہ کے لیئے اور سارے ہندوستان کے لیئے ایک جمہوری نظام حکومت قایم کرتا ہے۔ اور خاصکر برطانوی نمونہ کی جمہوریت معرض وجود میں لانا چاہتا ہے حالانکہ انگلستان اور ہندوستان کے حالات زندگی یکساں نہیں ہیں۔ انگلستان کے بسنے والے زندگی کے جملہ بُنیادی اُمور میں یکساں ہیں، وہاں کثرت کی حکومت قوم کے رُجحانات کا عام طور پر صحیح عکس ہو سکتی ہے، وہاں کسی کو مخصوص نمایندگی یا تحفظ کی ضرورت نہیں اسکے برخلاف ہندوستان میں برطانوی وضع کی جمہوریت یا اکثریت کی حکومت کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک ہی فرقہ یا قوم جسکو اکثریت حاصل ہے مگر جس کی زندگی کے بنیادی اصول دوسرے فرقوں سے بالکل مختلف ہیں، حکومت کریگی۔ پس ظاہر ہے کہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ جس قسم کی جمہوریت قایم کرتا ہے یا جس مستعمراتی صورت Dominion form کیطرف رہنمائی کرتا ہے وہ ایسی جمہوریت ہے جسکے ماتحت اقلیت والی قوموں کو محکوم قوموں کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہوگی اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اقلیت والی قوموں کے لیئے ایسی جمہوریت کوئی جمہوریت نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگرس جو اس جمہوری مشین کو چلانے میں سرگرم عمل ہے ممکن ہے اس امر سے انکار کرے کہ وہ ہندو راج قایم کرنا چاہتی ہے لیکن واقعات اس انکار کی تردید کرتے ہیں۔ مجھے کانگرس کی پُوری تاریخ پر جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں، میں صرف ۱۹۳۲ء کے اُس واقعہ کی یاد دلانا چاہتا ہوں جب گاندھی جی یروڈا میں ایک بظاہر انتخابی مسئلہ کے لیئے اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔ مسئلہ کیا تھا یہ کہ اچھوت اقوام کو ملک کی قانون ساز مجالس میں ایسے نمایندوں کے بھیجنے کا حق دیا جائے جنکا انتخاب خود ان اقوام نے کیا ہو اور جنہیں انکا اعتماد حاصل ہو اس حق کو روکنے کے لیئے گاندھی جی نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اُنہوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر یا ہندوستانی قومیت کی خاطر ایسا نہیں کیا تھا

بلکہ جیسا کہ خود انھوں نے فرمایا ہے۔ "ہندو جاتی کو مستحکم کرنے کے لیے .... اس یادگار فاقہ سے کچھ ہی دن پہلے انہوں نے گول میز کانفرنس میں اپنے خیالات یوں ظاہر فرمائے تھے۔

"میں اچھوتوں کے اہم مفاد کو ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر بھی نہ بیچوں گا۔ میں یہاں نہ صرف کانگرس کیطرف سے بول رہا ہوں .... بلکہ خود اپنی طرف سے بھی۔ اس سے ہندو جاتی میں افتراق پیدا ہو جائے گا۔ جس کو میں کسی صورت میں بھی اطمینان سے نہیں دیکھ سکتا" پھر یرودا میں انہوں نے اسی خیال کا اعادہ یوں فرمایا تھا

"یہ میرا یقین ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب جو خالص سیاسی نقطہ نظر سے کیسے بھی کیوں نہ ہوں، اچھوتوں اور ہندو مت دونوں کے لیے مضر ہیں وہ ہندو مت کی شکست و ریخت کر کے اسکا شیرازہ بکھیر دینگے"۔

یہ ہے کانگرسی نظام کی کنجی جسکا پیش کرنیوالا خود کانگرس کی کشتی کا ناخدا ہے۔ گویا کانگرس کے نزدیک بھی سیاست مذہب سے الگ نہیں ہے۔ اگر کانگرس کے انتخابی انتظامات کا منشا ہندو مت کو مضبوط کرنا یا ہندو قومیت کو فروغ دینا ہے اور مسلمان بھی اپنے لئے جداگانہ انتخابی حلقوں کو ملّت اسلامی کے بچاؤ اور مسلم قومیّت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو پھر دونوں کے لیے بہتر یہی ہو گا کہ وہ دو ایسی قوموں کی حیثیت سے جو اپنے اپنے تہذیبی نصب العین کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں مگر جنہیں حالات نے ایک ہی سرزمین پر بسا دیا ہے۔ مساوات بنیاد پر مصالحت کرلیں اور ایک ایسا میثاق ترتیب دیں جو ایک دوسرے پر دست درازی کو روکے اور ایسا جذبہ پیدا کرے جو ملک کی فلاح و بہبود کے لیے مل جُل کر پُرامن طریقہ پر کام کرنیکا محرک ہو

تہذیبی تحفظات

اس بات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ جہاں مسلمان یا ہندو اقلیت میں ہیں وہاں اُنکے مذہب، شخصی قانون، اور تہذیب کے تحفظ کے لیئے کانگرس آمادہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس

آمادگی کا مطلب کیا ہے؟ اس بڑے بول میں کیا کیا باتیں پنہاں ہیں؟ اور اس وعدہ کو ہر طبقہ سے
نباہتے ہوئے، حکومت ہندوستان میں واحد قومیت Single Nationality کس طرح پیدا
کرے گی یہ ظاہر ہے کہ "مذہب، شخصی قانون، اور تہذیب" زندگی کی قریب قریب ہر بڑی عملیت
(Activity) پر حاوی ہیں، چاہے وہ عملیت روحانی، سماجی، معاشی یا تعلیمی (ذہنی، اخلاقی
اور جمالیاتی) ہو اور مسلمانوں کے باب میں تو سیاسی جد وجہد بھی اس دائرہ سے باہر نہیں رہتی،
کیونکہ ان کی زندگی ایک ایسے ہمہ گیر ضابطہ حیات کی تابع ہے جس کو عرف عام میں شریعت کہا
جاتا ہے، گویا کانگرس کے وعدہ کے ماتحت شریعت کا تحفظ بھی ضروری ہوگا۔ لہذا اگر زندگی کے
ان تمام شعبوں کو جن پر شریعت محیط ہے بلا شرکت غیرے مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے تو نظم و
نسق کے تمام اہم شعبوں میں جن میں عدالت، کوتوالی اور تعلیم بھی شامل ہوں گے مسلمانوں
کے لیے متوازی انتظامات Parallel arragements کرنے پڑینگے۔ اور اگر یہ سب انتظامات کر دیے
جائیں پھر حکومت کے پاس کیا رہ جائے گا جسکی مدد سے وہ سارے ملک کے لیے متحدہ قومیت
کے ڈھانچہ کو کھڑا کریگی، کیا ہر بڑے تحفظ کا وجود بجائے خود عضوی وحدت (Organic Uuity) کا بطلان
نہیں ہے، ؟ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں، عیسائیوں، وغیرہ کے تحفظات کو تسلیم کرنے کا
نتیجہ فی الحقیقت تہذیبی اعتبار سے خود مختار قوموں کا قیام ہوگا[ط] واحد قومیت کی تشکیل نہ ہوگی۔ پھر
اس کھلی ہوئی حقیقت کو کیوں تسلیم نہ کر لیا جائے اور ۱۹۳۵ء کی سیاسی مشین کی جگہ جو بطاہر ایک
متحدہ قومیت کے لیے تیار کیگئی ہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، کوئی اور مشین بنائی جائے جو
ہندوستانی قوموں کے وفاق کے لیے جنہیں تہذیبی خود مختاری حاصل ہو۔ موزوں ہو۔ ہندوستان
میں اتحاد کے حصول کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اسکے سوائے اور کوئی طریقہ نہیں۔ لیکن چونکہ کانگریس
ایسے تصور پر غور کرنے کے لیے مائل نظر نہیں آتی بلکہ ہندو قومیت کے مفاد کی خاطر موجودہ مشین
سے فائدہ اٹھانے پر وہ تلی ہوئی ہے، اسلیے قدرتی طور پر مسلمان بھی اس پر اڑے ہوئے ہیں کہ
جن تحفظات کے وعدے کیے گئے ہیں انہیں دستور Constitution کا ایک مستقل جزو قرار

ط Federation of culturally autonomous nationalities

دیدیا جائے کیا کانگرس سمجھتی ہے کہ یہ اصرار کیوں ہے ؟

خانہ جنگی کے قرائن

اگر میں مسلمانوں کے منشا کو واضح کرنا چاہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اِس شرط پر محض اسوجہ سے مُصر ہیں کہ اگر اُنکے ہندو ہموطن اپنی تعداد کے گھمنڈ میں کسی وقت بدعہدی کریں تو مُسلمانوں کو خود دستور کے برقرار رکھنے کے لیئے لڑنے کا اخلاقی حق حاصل رہے مُسلمانوں میں کسی نہ کسی وجہ سے یہ احساس قوی ہوتا جارہا ہے کہ ہندو اکثریت نئے سیاسی اقتدار کے نشہ میں زود یا بدیر اپنی تہذیب کو حکومتی مشین کے ذریعہ سارے مُلک کے سر تھوپنے کی کوشش کریگی اور اسوقت مُسلمانوں کو اپنے بچاؤ کی غرض سے شاید خانہ جنگی کی مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ مسلمانوں کا یہ اصرار کہ اُنکے تہذیبی تحفظات کو دستور میں جگہ دی جائے۔ حقیقت میں ایک اخلاقی حق حاصل کرنے کی کوشش ہے، تاکہ اگر ــــ خدانکردہ ــــ کبھی اِس کی ضرورت ہو تو وہ ایک پاک ضمیر کے ساتھ میدان میں آسکیں اور اُن کی شکایت ایک آئینی تائید کے ساتھ مہذب دُنیا کی ہمدردی حاصل کرسکے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ مذہبی اور تہذیبی تحفظات کو دستور میں شامل کرنے کے مطالبہ کا منشا یہی ہے اور اسی وجہ سے مُسلمانوں کے نزدیک کانگرسی وزراء کے یا خود کانگرس کے محض وعدے کوئی وزن نہیں رکھتے

ہمیں سچے دل سے دُعا کرنی چاہیئے، کہ ہمارا ..... ملک خانہ جنگی کی بلا سے بچا رہے مگر اکثریت رکھنے والی ہندو قومیت کو حکومتی مشین کے ذریعہ (خصوصاً مسلمانوں کے سر تھوپنا خود خانہ جنگی کو دعوت دینا ہوگا۔ پچھلے زمانوں میں ہندوستان کی خانہ جنگیاں فرقہ وار نہیں تھیں، وہ ایسے حکمران خاندانوں یا لالچی لیڈروں کے درمیان ہوتی تھیں جو بھاڑے کی فوج کی مدد سے کسی بلند جذبہ کی بجائے ذاتی ہوسناکیوں کے لیئے لڑتے بھڑتے تھے۔ اِسکے برعکس ہندوؤں اور مُسلمانوں کی لڑائی اگر خدانخواستہ کبھی ہوگئی تو وہ بالکل مختلف بنیادوں پر ہوگی، وہ ایسی جنگ ہوگی جس سے ہندوستان کو اپنی طویل تاریخ میں کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ وہ کسی ایک صوبہ میں محدود نہ ہوگی۔ ایسی جنگ سے سب کو بچنا چاہیئے۔

ہندوستان کا مسئلہ

ہندوستان کے اتحاد کا مسئلہ ایک کھلا تہذیبی مسئلہ ہے اور وہ ان دونوں قوموں کی تہذیبوں کی بقا سے وابستہ ہے جو ایک دوسرے میں ضم ہونا تو نہیں چاہتیں مگر رواداری کے ساتھ باہم مل جل کر رہنا چاہتی ہیں۔ ان حالات میں واحد قومیت کے تصور کو بالکل چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ تصور موجودہ ہندوستانی ماحول میں بارآور نہیں ہوسکتا اور نہ برطانوی پارلیمنٹ کا کوئی دستور، چاہے وہ ہندوستان کو فوراً استعمراتی درجہ بھی کیوں نہ دیتا ہو — اس مقصد کو پورا کرسکتا ہے۔ گہری اور مستقل بدگمانیوں نے جگہ پکڑلی ہے، ہندوؤں کو اسکا ڈر ہے کہ ہندوستان برطانوی تسلّط سے آزاد ہوگیا تو کہیں شمال مغرب سے مسلمانوں کا سیاسی اثر پھر نہ گھس پڑے۔ کیونکہ اس سمت میں اسلامی ممالک کا سلسلہ بحرِ اوقیانوس تک پھیلا ہوا ہے اور اُن ممالک میں چپکے چپکے وہ شعور کام کر رہا ہے جو عجب نہیں ایک دن نئی قوتوں کو حرکت میں لاکر دنیا کے مختلف حصوں میں سیاسی اقتدار کو ازسرِنو عمل میں لے آئے۔ ہندو قوم زبان سے کچھ ہی کہے مگر وہ دل سے پورنا سوراج یا ایسی آزادی چاہتی ہے جسکا اظہار آئین ویسٹ منسٹر میں ہوسکے یعنی ایسی آزادی جس سے ہندوؤں کو ایک طرف تو ملک کے اندرونی نظم ونسق پر قابو حاصل ہوجائے اور دوسری طرف — شمال مغرب کی جانب سے حملہ ہونے کی صورت میں — برطانوی تائید حاصل رہے۔ اُسکے برخلاف مسلمانوں کی قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر ہندو قوم کو ایسی قوت حاصل ہوگئی تو مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیئے اُنکے زیرِ نگیں رہنا پڑے گا۔ اور اپنی مذہبی، اخلاقی، اور تہذیبی بنیادوں پر آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع باقی نہیں رہے گا۔ جانبین کی یہ بدگمانی اصلیت سے خالی نہیں ہے اور اسکو ہمیشہ کے لیئے دُور کرنا ضروری ہے۔

حل

اس کا حل جو بھی تجویز کیا جائے۔ اُس میں دو چیزوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے:۔

(۱) ہر قوم کی تہذیبی آزادی اور (۲) ہندوستان کا سیاسی اتحاد۔ اور اگر یہ دونوں

ناگزیر قرار پائیں تو ملک کے سامنے دو راستوں میں سے ایک راستہ کھلا ہوا ہے یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیئے کہ ان دونوں راستوں میں سے ایک دوسرے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ایک طریق تو یہ ہے کہ ہر فرقہ یا قوم کو موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے اور اپنے تعلقات کو اس طرح درست کر لینے کا موقع دیا جائے کہ اُن میں سے کوئی ایک دوسرے پر دست درازی نہ کر سکے دوسری صورت یہ ہے کہ موجودہ حالات ہی کو بدل دیا جائے اور ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیئے ایسے جداگانہ وطن یا تہذیبی حلقے بنا دیئے جائیں جو ایک مشترکہ سیاسی مرکز سے وابستہ رہیں اور اس طرح اُن ختم نہ ہونے والے قضیوں کو ہمیشہ کے لیئے رفع کر دیا جائے جو ان دو قوموں کے تہذیبی نصب العین کے بنیادی اختلاف کیوجہ سے ہر جگہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

باہمی تصفیہ کے اِن دو طریقوں میں سے پہلے طریقہ کو فوراً اختیار کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اکثریت والی قوم کے لیڈر ہمدردی اور واقعیت پسندی کے ساتھ حالات پر نظر ڈالیں اور ایک ایسے ادارہ کے ذریعہ جس کی ساخت میں ہندو عنصر علانیہ غالب ہے سارے ملک کی نیابت کے حق کو اپنا اجارہ قرار دینے کی کوشش نہ کریں۔ ایسی کوشش محض ایک شائستہ فریب ہے اور فریب انجام کار سودمند نہیں ہوتا۔ وہ اپنا ردِ عمل آپ پیدا کریگا جس سے مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جائے گا محفوظ ترین راستہ یہ ہے کہ ہر قوم کو اس کی اجازت دیجائے کہ وہ خود اپنے ادارہ Organisation کے ذریعہ اپنا قومی نشانہ ظاہر کرے۔ انصاف کا بھی تقاضا یہی ہے اور بدگمانیوں کو دُور کرنے کے لیئے ملک کی فوری ضرورت بھی یہی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ مختلف قومی اداروں کے نمایندوں کا ایک ہم آہنگی پیدا کرنیوالا مشترکہ ادارہ (Co-ordinating Agency) تشکیل دیا جائے تاکہ وہ ایک ایسا نظام العمل مرتب کرے جسکے تحت سب اکھٹے ہو کر ایسے دستور کے حصول کے لیئے کام کریں۔ جو فی الحال ملک کی ہر قوم کے لیئے قابل قبول ہو اور ہر اقلیت والی قوم کے لیئے اُسکے مذہب شخصی قانون اور تہذیب کے متعلق ضروری تحفظ کے اسباب مہیا کر دے اور معاشی تحفظ کا بھی اطمینان دلائے۔ کیونکہ اسکے بغیر کوئی تہذیب نہ زندہ رہ سکتی ہے اور نہ پھل پھول سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا دستور

ہو جس میں ایک قوم کو دوسری قوم پر دست درازی کا موقع نہ ملے اور ساتھ ہی وہ مختلف اقوام میں ایک دوسرے کے فلاح و بہبود اور مشترکہ وطن کے دائمی مفاد کے لیئے مل جل کر کام کرنے کا مقدس جذبہ پیدا کرے۔

حصہ دوم

تہذیبی منطقوں کی تشکیل

یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا ہندوستان کے مسئلہ کا یہی آخری حل ہے؟ آخری حل کا انحصار بہت کچھ اس روش پر ہے جو ہر قوم کی آئینوالی نسلیں اختیار کرینگی۔ لیکن کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایک مخلوط زندگی میں وقتاً فوقتاً کیا کیا ہوتا رہے گا اسلیئے یہ خیال اور بھی قوی ہو جاتا ہے کہ ہمیں ایسی چیز کیطرف قدم اٹھانا چاہیئے جو اُن تحفظات سے زیادہ دیرپا اور مستقل ہو جن کی نسبت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مؤثر طریقہ پر خوش اسلوبی کے ساتھ کارگر ثابت ہونگے

بین الاقوامی دُنیا میں حیات جدید کا میلان یہ ہے کہ ہر تہذیبی وحدت Cultural unit کو ایک جغرافیائی وطن حاصل رہے جسکو ہر متنفس اپنا وطن کہہ سکے اور جسکی بنیاد پر ایک خوش حال قومیت کی تعمیر کیجا سکے بجائے اسکے کہ ہم اُن دیسی ریاستوں اور صوبہ جات کے وفاق کے ذریعہ ہندوستان میں اتحاد پیدا کریں جو ہماری پچھلی جنگ آزمائیوں کی پیداوار ہیں اور جہاں ہر جگہ ہندو مسلم مسئلہ حیات عامہ کو تباہ کر رہا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آبادی کے تبادلہ کی اسکیم کے ذریعہ جو سہولت کے ساتھ کئی سال میں نافذ ہو سکے ہم ایسی آزاد مملکتوں کے عہدیہ یا وفاق کی تشکیل کی کوشش کریں جو تہذیبی اعتبار سے خود مختار ہوں؟

موجودہ حالات کے ماتحت ہندوستان کے مسلمانوں کو چار ہم جنس تہذیبی منطقوں (Cultural Zone) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اسی طرح ہندوؤں کے لیئے کم سے کم گیارہ تہذیبی

منطقے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ اور دیسی ریاستوں کی بھی جو سارے ملک میں منتشر ہیں اُنکے فطری رجحانات کے مطابق مختلف تہذیبی منطقوں میں تقسیم عمل میں آسکتی ہے ۔۔۔ ایسا ہر منطقہ ایک آزاد خود مختار مملکت ہوگا جسکا اندرونی انتظام وفاقی صورت اختیار کریگا اور اسکو اسی طرح کی دوسری آزاد مملکتوں کے ساتھ ایک کُل ہندی وفاقی یا عہدیہ (All India Confederacy) میں موزوں جگہ حاصل رہیگی۔

مُسلم تہذیبی منطقے

شمال مغربی حلقہ۔ پہلے مسلمانوں کو لیجئے۔ اسوقت شمال مغرب میں مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ ہے جو سندھ، بلوچستان، پنجاب، صوبہ سرحدی اور خیرپور و بہاولپور کی ریاستوں پر مشتمل ہے ان چھ علاقوں میں ایک وفاقی تعلق پیدا کر کے اس سارے رقبہ کو ایک واحد خود مختار مملکت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اسمیں ۲ کروڑ پچاس لاکھ مسلمانوں کو اپنا آزاد وطن ملجائیگا۔[1]

شمال مشرقی حلقہ۔ ہندوستان کے دوسرے سرے پر شمال مشرق میں بنگال اور آسام میں مسلمانوں کا ایک پورا حلقہ تین کروڑ سے زائد آبادی پر مشتمل ہے جو اپنی ایک خاص سیاسی زندگی بسر کرسکتا ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کا حلقہ۔ متذکرہ صدر ۲ حلقوں کے درمیان مسلمانوں کی آبادی غیر مساوی طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ان ۲ حلقوں میں سے اپنے سے قریب تر حلقہ میں بس سکتے ہیں اور باقی جن کی بڑی تعداد بہار اور صوبہ متحدہ میں آباد ہے اور جن کی آبادی قریب ایک کروڑ بیس لاکھ ہے انہیں ایک ایسے حلقہ میں مجتمع کیا جاسکتا ہے جسکی سرحدیں ریاست پٹیالہ کے مشرق سے لکھنؤ تک وسیع ہوں گی اور جس میں رام پور بھی شامل ہوجائے گا

دکن کا حلقہ۔ بندھیاچل اور ستپوڑہ کے جنوب میں جو مسلمان آباد ہیں اُنکا معاملہ خاص غور و فکر کا مستحق ہے یہ سارے جنوبی ہند میں منتشر ہیں، ان کی آبادی کے رقبوں میں کوئی یکسانیت نہیں ہے

---

[1] اس تجویز کو پاکستان کے تخیل سے نہیں ملانا چاہیئے وہ ایک ایسی تحریک ہے جو خاص کر شمال مغرب کے مسلمانوں کے مفاد سے تعلق رکھتی ہے، اسکیم جو یہاں پیش کی جارہی ہے وہ کل ہند زاویۂ نگاہ کے حامل ہے وہ تمام ہندوستانی اقوام کے لیئے اندرونی تہذیبی تحفظ کا یقین دلاتی ہے اور اُن کے درمیان ایک مستقل سیاسی اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے۔

اور اُن کی تعداد کم و بیش ایک کروڑ بیس لاکھ ہے اُنکے لیئے ایک حلقہ کے تراشنے کی ضرورت ہے۔ اور ایسا حلقہ حیدرآباد کی ریاست فراہم کرسکتی ہے۔ اس غرض کے لیئے جنوب کیطرف سے ایک خطۂ اراضی، جو اضلاع کرنول، کڑپہ، چتوڑ، شمالی ارکاٹ اور چنگلی پیٹ سے گزر کر شہر مدراس تک پہنچتا ہے حیدرآباد کو واپس دیا جاسکتا ہے۔ ایسا خطہ جسکا راستہ سمندر کیطرف کھلا ہوگا مسلمان تاجروں اور ساحل پر رہنے والوں کی اُس بڑی جماعت کو آباد کرنے کے لیئے ضروری ہوگا جو صدیوں سے ساحل کارومنڈل اور ملیبار پر آباد ہے، اِس حلقہ کی تشکیل ہر فریق کے لیئے مفید ثابت ہوگی اور اُس کی بدولت پانچ جداگانہ ہندو اقوام یعنے مرہٹہ۔ کنڑی، ملیالی، ٹامل اور آندھرا کے لیئے کامل آزادانہ وجود کا موقع بہم پہنچے گا اور اُن کی جداگانہ سرحدیں قایم ہوسکیں گی، حیدرآباد کا موجودہ رقبہ لسانی اعتبار سے ایک وحدت نہیں ہے۔ شمال مغربی اضلاع کی زبان مرہٹی ہے جنوب مغربی اضلاع کی کنڑی اور مشرقی اضلاع کی تلنگی۔ ریاست حیدرآباد کے تلنگی بولنے والے باشندے صوبۂ آندھرا میں ضم ہوسکتے ہیں جو شمالی سرکار گنٹور، نلور پر مشتمل ہوگا اور جس میں کرنول، کڑپہ اور چتور کے کچھ حصے اور صوبۂ متوسط کا ایک خطہ شامل ہوگا۔ مرہٹے اور کنڑے مغرب اور جنوب مغرب میں اپنی قوموں میں جذب ہوجائیں گے جنوبی ہند کے مسلمان جو دکن کے حلقہ میں آجائیں گے۔ انمیں یہ تاریخی شعور پیدا ہوگا کہ وہ اُس اسلامی تہذیب کے وارث ہیں جو یہاں صدیوں سے نشو و نما پاتی اور پھلتی پھولتی رہی ہے اور جو عہدِ مغلیہ میں جب کہ یہ سارا علاقہ ایک ہی صوبہ میں شامل تھا۔ اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

اس حلقہ کے لیئے جو رقبہ قرار دیا گیا ہے وہ ان مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے جو یہاں آباد کیئے جائیں گے بظاہر بڑا معلوم ہوگا۔ لیکن یہاں چند خاص اُمور کو پیش نظر رکھا گیا ہے، ریاست حیدرآباد کے بڑے بڑے علاقے ابھی نشو و نما نہیں پاسکے ہیں وہ یا تو صحرائی رقبے ہیں یا پہاڑی اور بنجر علاقے ہیں، اور مسلمانوں کو ایک وسیع جزیرہ نما یعنے جنوبی اوڑیسہ، صوبۂ متوسط صوبۂ بمبئی و مدراس اور میسور ٹراونکور اور کوچن سے لاکر یہاں مجتمع کرنا ہے۔ گزشتہ تیس پینتیس سالوں میں ان علاقوں کے مسلمانوں کی آبادی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور ان کی آئندہ وسعت پذیری کو بھی ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

اسکے سوا شمال مشرق اور دہلی و لکھنؤ کے حلقوں کے مسلمان چھوٹے رقبوں میں محدود رہیں گے۔ ان حلقوں کی آبادی اگر بڑھے تو اسکو آئندہ دکن کے حلقہ میں بسایا جاسکتا ہے اس امر کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ چھوٹے چھوٹے فرقے جیسے عیسائی اور صحرائی اقوام اور ہریجنوں کا ایک بڑا طبقہ جو یہاں کی آب ہوا سے مانوس ہوگیا ہے، خاص مراعات کے تحت یہیں رہنا پسند کریگا اور اس رقبہ میں جتنی آبادی ہونی چاہیئے اُسکی تکمیل کرے گا۔

مسلمانوں کے چھوٹے منطقے مسلمانوں کے لیئے یہ چار حلقے بنانے کی تجویز میں اُن مسلمانوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا جو راجپوتانہ، گجرات، مالوہ اور مغربی ہند کی دیسی ریاستوں میں رہتے ہیں، انہیں بھوپال، ٹونک، جوناگڈھ، جاورہ، اور دوسری اسلامی ریاستوں میں تبادلۂ آبادی کی بنیاد پر مجتمع کرنا ہوگا۔ اور اجمیر کو بھی جو مسلمانوں کے لیئے خاص اہمیت رکھتا ہے ایک محفوظ مرکز قرار دینا ہوگا

ہندوؤں کے تہذیبی منطقے

اب اسکے بعد باقی ہندوستان گیارہ تہذیبی منطقوں میں منقسم ہوسکے گا جس سے ہندوؤں کے ہر تہذیبی مفاد کو استقلال حاصل ہوجائیگا۔ اگر مشرق سے شروع کریں تو بنگال (۱) کا ایک حصہ موجودہ بہار کے تھوڑے سے ایسے حصے کے ساتھ جو تہذیبی مناسبت رکھتا ہے، بنگالی ہندوؤں کے لیئے ایک جداگانہ حلقہ بنجائیگا۔ اوڑیا بولنے والے باشندوں کو ایک عظیم تر اوڑیسہ (۲) میں مجتمع کیا جاسکتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے مجوزہ اسلامی حلقہ سے لیکر مغربی بہار تک اور ہمالیہ سے لیکر بندھیاچل تک جو علاقہ پھیلا ہوا ہے وہ وسط ہند کی ریاستوں کے ساتھ ایک علیحدہ حلقہ بن سکے گا۔ ہندوؤں کے مقامات مقدسہ ہردوار الہ آباد، بنارس اور متھرا وغیرہ سب کے سب اس رقبہ میں آجائیں گے۔ یہ ہندوستان خاص (۳) کا علاقہ ہوگا جہاں آریوں کی بنیادی تہذیب جس میں نئی روح پھونکی جائیگی۔ اِس آزادی کو اُجاگر کرنیکا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگی۔ راجپوتانہ (۴) کی ریاستیں باہم ملکر ایک اور حلقہ تشکیل دینگی جو ان کی قدیم رزمی زندگی کی یاد تازہ کریگا۔ گجرات (۵) کو کاٹھیاواڑ کی ہندو ریاستوں کے ساتھ ملا کر ایک علیحدہ حلقہ قرار دیا جاسکتا ہے جہاں گجراتی تہذیب خاطر خواہ ترقی کرسکے گی، مرہٹہ قوم (۶)

[illegible]

کے لیئے جو اپنی نمایاں قومی خصوصیات اور اپنی تہذیب رکھتی ہے ایک جُداگانہ حلقہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دراوڑی تہذیبوں کے مجموعہ کے لیئے جنسے کنڑی (۷)، آندھرا (۸)، ٹامل (۹) اور ملیالی (۱۰) تہذیبیں مُراد ہیں ان کی اپنی بنیادوں پر جُداگانہ نشوونما پانے کی صُورت نکالی جاسکے گی

شمال مغرب کے مسلم حلقہ میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لیئے ایک حلقہ (۱۱) تشکیل دینا ہوگا۔ اُنکے متعلق یہ ہوسکتا ہے کہ سندھ کے ہندوؤں اور سکھوں کے لیئے ایک حلقہ تشکیل دیا جاسکتا ہے جس میں وہ سکھ اور ہندو ریاستیں شامل ہوں گی جو اسوقت پنجاب ایجنسی کے تحت ہیں اور جو تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے کوئی اہم اختلاف نہیں رکھتیں۔ کشمیر کی ہندو ریاست اسی ہندو سکھ حلقہ میں شامل کرلیجا سکے گی۔ اس ریاست کی آبادی میں مسلمانوں کا عنصر نمایاں طور پر غالب ہے چند اضلاع میں مسلمان ہی زیادہ تر آباد ہیں۔ ان کو باہمی سمجھوتہ کے ذریعہ پنجاب خاص میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اور اسکے معاوضہ میں موجودہ پنجاب کے شمال مشرق کا ایک حصہ جس میں وادی کانگڑہ بھی شامل ہوگی، مہاراجہ کے حدود اختیار میں داخل کیا جاسکتا ہے، مُلک کے اس حصہ میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو آباد کرنے کے لیئے یہ حلقہ کافی وسیع ہوگا۔

شاہی کمیشن

مذکورۂ بالا ہندو اور مسلم حلقوں کی تشکیل سے ہر تہذیبی وحدت کی سیاسی اُمنگیں پُوری ہوجائینگی اور ہر ایک کے لیئے خود اسکا ایک وطن مہیا ہوجائے گا جو اسکی آبادی کے تناسب کے مطابق ہوگا۔ مختلف حلقوں کی حدبندی جو اوپر پیش کیگئی ہے اسکی نوعیت محض ایک تجویز کی ہے، اور اُسکا صحیح تعین ایک شاہی کمیشن کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔

تبادلۂ آبادی

اس میں شک نہیں کہ تبادلۂ آبادی کا خیال اکثر لوگوں کے دل میں، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جو کسی خاص سرزمین سے وابستہ ہیں، پہلے پہل ایک قسم کی بے کلی پیدا کردیگا لیکن جو فوائد اس سے حاصل ہونگے وہ اس قسم کی بے کلی یا جذبہ کو بالکل بھلادینگے۔ اگر ہر فرد کے لیئے اُسکے نئے وطن میں وہ

مفادات کا ایک قانون کے ذریعہ تحفظ کیا جائیگا جو "اقوام ہند کا قانون عامہ" کے نام سے موسوم ہوگا اور جسکو مرکزی حکومت نافذ کریگی، یہاں یہ اضافہ کر دینا ہوگا کہ اگر کوئی قوم مقبرے، عبادت گاہیں، تاریخی یادگاریں، اور قبرستان اپنے پیچھے چھوڑ جائے تو اُن کو برقرار رکھا جائیگا۔ اور ہر آزاد مملکت مرکزی حکومت کی نگرانی کے تحت اُن کی حفاظت کریگی

ہندوستانی عیسائی وغیرہ ہندوستانی عیسائی، انگلو انڈین پارسی یا بدھ مت والوں کے مسئلہ پر یہاں بحث نہیں کیگئی ہے اِس مسئلہ کو ابھی کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی ہے، اور مناسب تصفیہ کے لیئے اسکو مستقبل پر چھوڑنا چاہیئے۔ اُسوقت تک ہر مجوزہ آزاد مملکت کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یہ چاہیئے کہ انہیں تمام ضروری مذہبی، تہذیبی اور معاشی تحفظات عطا کرے تاکہ وہ ایک مشترکہ زمین کے فرزندوں کی طرح باعزت زندگی بسر کرسکیں۔

البتہ ہریجنوں کا مسئلہ ایک بالکل جداگانہ بنیاد پر قایم ہے، انکا طبقہ کچھ چھوٹا نہیں ہے وہ کروڑہا کی تعداد میں، سارے ملک میں منتشر ہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی نسلوں کے اقسام بھی بے شمار ہیں اور اُنکی کوئی مشترکہ تہذیب بھی نہیں ہے، انہیں اس امر کی کامل آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی جگہ ہندو قومیت میں یا کسی دوسری قومیت میں حاصل کریں کیونکہ اگر انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے تو انکو اپنی کوئی تہذیب نمود دینے کے لیئے صدیاں لگ جائیں گی۔

خاتمہ ہندوستان کے مسئلہ کا یہ ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی ترتیب میں حقیقت آشنا خلوص نے میری رہبری کی ہے اسلیئے مجھے اسکا حق ہے کہ اُسپر واقعیت پسندی کے غور کرنیکی اپنے ہم وطنوں سے التجا کروں۔ میں اس اندیشہ سے خالی نہیں کہ وہ لوگ جو غور و فکر کی زحمت سے دُور رہنا چاہتے ہیں یا وہ جو دوسروں کی تاریخی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے سے کبھی نہیں چوکتے اس تجویز کو ایک لا امکانی یا باد ہوائی بات باور کرانیکی کوشش کرسکتے ہیں، مگر آنیوالی نسل جس کو بہت نزدیک سے زندگی کے حقائق اور واقعات سے نبٹنا پڑیگا وہ اس تجویز کی افادیت سے متعلق بہتر رائے قایم کریگی، ہمارے لیئے تو سوال یہ ہے کہ آیا اس عقدہ کو ہم خود حل کریں یا اُسے آنیوالی نسل کے لیئے اُبھار کہیں جو فیصلہ ہم کرینگے۔ آنے والی نسل ہمیں اسی سے جانچیں گی

تمام معاشی اسباب مہیا کردیے جائیں جو اسکو پہلے مقام پر حاصل تھے تو زمین دوستی کے جذبہ کے بجائے ایک نیا جذبہ جو کہیں زیادہ بلند اور شریف ہوگا پیدا ہوجائے گا جو اُسکے لیئے کافی صلہ ایک دوسرے کی خیر سگالی اس مجوزہ تبادلۂ آبادی کی محرک ہوگی اور نہ صرف ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی خاطر عمل میں لائی جائیگی بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دائمی طور پر یقین دلانے کے لیئے بھی کہ وہ اپنی اپنی تہذیبی بنیادوں پر اپنے اپنے وطن میں آزاد زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان حالات میں ہر شخص کو چاہیئے کہ اُس زحمت کو جو ایسی منتقلی میں ضمناً پیش آجائے خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور تبادلۂ آبادی کے عمل کو کافی وسیع مدت تک مثلاً ۱۵ سے ۲۰ سال تک پھیلا کر ایسی زحمت کو کم کردیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کو ایسی زحمت پیش آئیگی۔ کیونکہ دو حلقوں سے قطع نظر جو شمال کے دونوں گوشوں میں واقع ہیں، مسلمان سارے مُلک میں منتشر بستیوں میں پھیلے ہوئے ہیں، دہلی اور لکھنؤ یا دکن کے حلقہ میں ان کو مجتمع کرنے کا مسئلہ ظاہر ہے کہ بڑی قربانیوں کا باعث ہوگا لیکن یہ بہتر ہے کہ اُن کی موجودہ نسل ہی مردانہ وار اس آزمائش کا مقابلہ کرے بجائے اسکے کہ وہ اس کام کو اپنی اولاد کے لیئے اٹھا رکھے۔ اسوجہ سے کہ پُرامن طریقہ پر آبادی کے تبادلہ کا جو موقع ہمیں اسوقت حاصل ہوسکتا ہے وہ بہت ممکن ہے کہ آنیوالی نسلوں کو حاصل نہ ہوسکے۔ ہندوؤں کے لیئے آبادی کا تبادلہ نسبتاً کمتر فاصلہ تک محدود رہے گا اور وہ اسی قسم کی آب وہوا کے علاقوں میں منتقل ہوجائینگے اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد کے اسلامی حلقہ سے آبادی کا تبادلہ تمام ہندوؤں کے حق میں اسوجہ سے مفید ہوگا کہ یہاں تین مختلف ہندو نسلیں آباد ہیں جو تین مختلف زبانیں یعنی تلنگی، کنڑی اور مرہٹی بولتی ہیں، اس اسکیم کے تحت وہ ہمسایہ ہندو حلقوں میں جاکر اپنے اپنے ہم نسلوں سے مل جائینگی اور اپنے ہم جنس لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرینگی۔

مجوزہ وفاق میں تحفظات

موجودہ تہذیبی وفاق قایم ہوجانے کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ بہت سے افراد جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف اغراض کے تحت وہیں رہیں جہاں وہ تھے، ایسے افراد کی ذات اور تہذیبی

خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۳۰ء الہ آباد

(حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

(حضرت علامہ کا اصلی خطبہ انگریزی میں ہے۔ جن حضرات نے آپ کی انگریزی تحریر دیکھی ہے وہ ہم سے متفق ہونگے کہ اسکا اردو میں ترجمہ کس قدر مشکل ہوتا ہے، بالخصوص اسوقت جبکہ لفظی التزام بھی پیش نظر ہو۔ اس ترجمہ میں الفاظ سے زیادہ مفہوم کی ادائیگی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اور وہ بھی اپنی استعداد کے مطابق، اسلیئے ہوسکتا ہے کہ کہیں ہم مفہوم کے سمجھنے اور اسکے صحیح طور پر ادا کرنے میں غلطی کر گئے ہوں۔ جسکے لیئے ہم بدل معذرت خواہ ہیں۔ طلوع اسلام)

حضرات! میں آپکا بے انتہا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں جو مسلمانان ہند کے سیاسی خیالات و اعمال کی تاریخ میں نہایت نازک ہے، مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان اجتماع میں بعض ایسے حضرات موجود ہیں جنکا موجودہ سیاسی تجربہ میری نسبت بہت زیادہ وسیع ہے اور امور مہمہ کے متعلق جنکی معلومات کی میرے دل میں بے انتہا وقعت ہے اسلیئے اگر میں ان سیاسی امور میں جنکے تصفیہ کے لیئے یہ حضرت آج اس جگہ جمع ہوئے ہیں انکی رہنمائی کا دعویٰ کروں تو یہ دعویٰ بالکل بیجا ہوگا۔ میں کسی جماعت کا لیڈر نہیں۔ اور کسی لیڈر کا پیرو نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اسکی شریعت اس کی سیاست مدن۔ اس کی ثقافت (کلچر) اسکی تاریخ اور اسکے ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس روح اسلامی کے ساتھ جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوتی جاتی ہے۔ میری مستقل وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کردی ہے جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کرسکتا ہوں جو اسلام کو

ایک عالمگیر حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت سے حاصل ہے چونکہ اس امر کے فرض کر لینے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ مسلمانانِ ہند اس روحِ اسلامی سے عہد وفا باندھ چکے ہیں اسلیے میرا منشا یہ نہیں کہ میں آپ کے فیصلوں میں آپکی رہنمائی کی جرأت کروں، بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس فراست کی روشنی میں جو مجھے حاصل ہے آپ کو اس اصل اساسی کا صحیح اور واضح احساس کرادوں جو ان فیصلوں کی عمومی تشکیل کر سکے +

اسلام اور قومیت Nationalism

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جو ایک اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کی سیاست مدن کا مجموعہ ہے (اس سے میری مراد ایک ایسے معاشرتی نظام سے ہے جو ایک خاص ضابطۂ قوانین کے ماتحت ہو اور جس میں ایک مخصوص اخلاقی تخیل کی روح کارفرما ہو)۔ مسلمانان ہند کی تاریخ حیات میں سب سے بڑا جزو ترکیبی رہا ہے اسنے وہ اساسی جذبات اور باہمی کشش کے سامان مہیا کئے ہیں جو منتشر افراد اور مختلف گروہوں کو بتدریج متحد کر کے بالآخر انہیں ایک ممتاز اور معین قوم کی صورت میں منظم کر دیتے ہیں جو اپنا مخصوص اخلاقی شعور رکھتی ہے، درحقیقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان ہی وہ ملک ہے۔ جس میں اسلام کا وہ شعبہ جو قوموں کی تعمیر سے متعلق ہے اپنی پوری آب و تاب سے کارفرما ہوا ہے، دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کے نظام ترکیبی نے سوسائٹی کی جو صورت اختیار کی ہے وہ صرف اس امر کی رہین منت ہے کہ اسلام ایک ایسے کلچر کی حیثیت سے عمل پیرا ہوا ہے۔ جس کا محرک ایک مخصوص اخلاقی تخیل ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی نے اپنی نمایاں ہم آہنگی اور قلبی یک جہتی کے ساتھ جو موجودہ شکل اختیار کی ہے وہ ان آئین و قوانین کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی ہے۔ جنکا اسلامی کلچر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن وہ خیالات جو مفکرین یورپ نے دنیائے سیاست میں پھیلا دیئے ہیں وہ ہندی و غیر ہندی مسلمانوں کی موجودہ نسل کے مطمح نگاہ کو نہایت تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں، ہمارے نوجوان ان خیالات سے متاثر ہو کر اس امر کے لیے مضطرب ہو رہے

ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں اِن خیالات کو عمل میں لے آئیں۔ وہ اِن حقائق پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے۔ جو یورپ میں اِن خیالات کے ارتقا کا باعث ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسیحیت صرف تارک الدنیا اشخاص کا ایک نظام سمجھا جاتا تھا جسنے رفتہ رفتہ ایک وسیع نظام کلیسائی کی صورت اختیار کر لی۔ لوتھر نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ اِس کلیسائی نظام کے خلاف تھی نہ کہ دُنیائے معاملات کے کسی نظام مدنیت کے خلاف۔ اسلیئے کہ عیسائیت کو تو کسی ایسے سیاسی نظام سے تعلق ہی نہیں، بلاشبہ لوتھر اِس نظام کے خلاف بغاوت کرنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ مگر میرے نزدیک اُسنے اِس امر کا احساس نہ کیا تھا کہ یورپ کے مخصوص حالات میں اِس بغاوت کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ حضرت مسیح کا عالمگیر نظامِ اخلاق کالعدم تہ و بالا ہو جائے گا۔ اور بے شمار قومی اور محدود نظام ہائے اخلاق اسکی جگہ لے لیں گے۔ رُوسو اور لوتھر جیسے آدمیوں کی اس قسم کی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت ٹوٹ کر ایسی کثرت میں تبدیل ہو گئی جسکے مختلف اجزاء میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی اور انسانیت کا ایک ہمہ گیر تصور قومیت کے تنگ دائرہ میں گھر کے رہ گیا۔ قومیت کا یہ تصور کسی محسوس بُنیاد۔ مثلاً عقیدۂ وطنیت پر ہی قایم ہو سکتا تھا اور اِسکا اظہار ایسے مختلف نظام ہائے سیاست کے ذریعہ سے ہی ممکن تھا جو قومی خطوط پر نشو و ارتقاء حاصل کر سکتے ہوں وہ خطوط جو صرف اِس اُصول کو ہی تسلیم کریں کہ سیاسی اتحاد کی بُنیاد جغرافیائی حدود پر ہی قایم ہو سکتی ہے۔ اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ٹھہرے کہ اِسکا تعلق کالعدم اگلے جہاں سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا، حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اُصول اخلاق کی جگہ قومیت کے نظریۂ اخلاق و سیاست نے لے لی۔ اِس تخریب و تعمیر اور ردّ و بدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے، اور انسان کی دُنیاوی زندگی سے اِسکا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام، وحدتِ انسانی کو روح اور مادہ کے دو الگ تھلگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ مذہب اور سیاست میں ناخن اور اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے اسکے نزدیک انسان کسی ایسی ناپاک دُنیا کا باشندہ نہیں

جیسے کسی ایسی مقدس دُنیا کے حصول کی خاطر تیاگ دینا پڑے جو اِس دُنیا سے الگ کہیں اور واقع ہو
اسلام کے نزدیک مادہ رُوح کی اس صورت کا نام ہے جو زمان و مکان کے لباسِ مجاز میں جلوہ
فرما ہے[1]۔ یورپ نے غالبًا مانی کے عقیدے سے روح و مادہ کی ثنویت (**Duality**) کا خیال
اخذ کیا۔ اور بلا تنقید اُسے قبول کر لیا۔ آج یورپ کے بہترین مفکر تو اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے
ہیں لیکن اُسکے سیاسی مدبر غیر محسوس طور پر دُنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اندھا دُھند اِس غلطی کو ایک
ایسے عقیدہ کی حیثیت سے قبول کر لے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ روح اور مادہ کی یہی
وہ غلط تفریق ہے جو یورپ کے مذہبی اور سیاسی افکار پر اِس نہج سے اثر انداز ہوئی ہے کہ اُسنے
یورپ کے نظام حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب بالکل خارج کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے یورپ
ایسی بے جوڑ سلطنتوں کا مجموعہ بنکے رہ گیا ہے جنکے سر میں انسانیت کا سودا نہیں۔ بلکہ اُسپر قومیت کا بھوت
سوار ہے۔ یہ بے جوڑ اُنمل سلطنتیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو پامال کرنے کے بعد
اب ایک متحدہ یورپ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہیں۔ یعنی پھر اسی وحدت کا احساس جسے مسیحی کلیسا
کے نظام نے ابتدا میں اُن کو دیا تھا لیکن اُنہوں نے بجائے اِسکے کہ حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اخوتِ انسانی
کے تصور کی روشنی میں اِسکی تشکیل کرتے لوتھر کی تعلیم سے متاثر ہو کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ دُنیائے اسلام
میں کسی لوتھر کا تصور ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ اسلام میں یورپ کے ازمنہ متوسط جیسا کوئی کلیسائی نظام
ہی موجود نہیں جو اپنے کسی تباہ کرنے والے کو بُلا رہا ہو۔ دُنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالمگیر نظام
سیاست موجود ہے۔ بنیادی اُصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ انکا سرچشمہ علم الٰہی ہے، اِن بنیادوں
پر جو عمارت قایم ہے، وہ البتہ ضروریاتِ زمانہ کے اقتضا کے مطابق ایک نئی رُوح کی محتاج ہے اور اِس
احتیاج کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے فقہا (واضعین قوانین) دُنیائے جدید کے داعیات سے متمسک
نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دُنیائے اسلام میں قومیت کے اس تصور کا انجام کیا ہوگا۔ پیشین گوئی
کرنا مشکل ہے کہ آیا اسلام اسکو اپنے اندر جذب کر کے اِسکی ترکیب کو بدل دیگا، جیسا کہ یہ اس سے
قبل بہت سے مختلف النوع خیالات کو اپنے اندر جذب کر کے ان کی نوعیت کو بدل چکا ہے یا خود اسلام

---

[1] To Islam matter is spirit realising itself in space and time

اس نظریہ کی قوت سے متاثر ہو کر اپنے نظام کو یکسر تبدیل کرلے گا۔ حال ہی میں مجھے لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے پروفیسر وین سنک (Wen Sinck) نے لکھا تھا کہ:۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اسوقت اُسی نازک دَور میں داخل ہو رہا ہے جو مسیحیت پر ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے طاری ہے، سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کونسا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے قدیم و قیانوسی غلط تصورات کی عمارت تو منہدم ہو جائے لیکن مذہب کی بنیادیں محفوظ رہیں۔ میرے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ میں بتا سکوں کہ اس بحران میں مسیحیت کا انجام کیا ہوگا، چہ جائیکہ میں یہ کہہ سکوں کہ اسلام پر اسکا کیا اثر ہوگا۔"

اور موجودہ دَور میں تو ہو یہ رہا ہے کہ قومیت کا تصور مسلمانوں کے مطمح نگاہ میں نسل پرستی کا جذبہ ابھار رہا ہے۔ جو اُن مساعیٔ حسنہ کو غارت کر رہا ہے جنہیں شرفِ انسانیت کی خاطر اسلام نے سرانجام دیا تھا۔ اور نسل پرستی کے اس شعور کا مطلب یہ ہے کہ نظامِ حیات کے متعلق ایسے نظریے اور معیار قایم ہو جائیں جو نہ صرف اسلامی نظریاتِ زندگی سے مختلف ہوں بلکہ اُن سے متصادم ہو جائیں مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے اس نظاہر علمی بحث Academic discussion سے معذور سمجھیں گے۔ آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے، اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو نگہ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسکی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دیگا۔ جسکا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے اور جسکا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اسکے ہاتھ میں رہیں گی اور اسکی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ

ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں، ہماری تاریخ میں اسلام پر کبھی ابتلا و آزمائش کا ایسا زمانہ نہیں آیا جیسا آجکل اسے درپیش ہے۔ (اس میں شک نہیں کہ) ہر ایک قوم اس بات میں مختار ہے کہ اپنے اپنے معاشرتی نظام کے اصول اساسی میں ترمیم، تاویل یا تنسیخ کرلے لیکن ایک تازہ تجربہ کرنے سے پہلے اسکے لیے قطعاً ضروری ہے کہ اپنے اس تجربہ کے نتائج و عواقب پر واضح انداز سے غور و خوض کرلے۔ اس اہم مسئلہ کو جس پہلو سے میں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے کسی شخص کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں ان حضرات سے جو مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، آمادۂ پیکار رہوں۔ یہ مسلمانوں کا اجتماع ہے اور میرا یقین ہے کہ اسکے افراد اسلام کی روح اور اسکے نصب العین سے قلبی تعلق کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اس لیئے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ موجودہ صورت حالات کے متعلق جس چیز کو میں نیک نیتی کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اس کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کردوں۔ صرف یہی وہ طریق عمل ہے جس کی رو سے میرے لیئے ممکن ہے کہ میں اپنی بصیرت کی روشنی میں آپ حضرات کے سیاسی مسلک کو واضح کرسکوں

قومیّت ہند کی وحدانیت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور اسکے مالہ و ماعلیہ کیا ہیں؟ کیا مذہب سچ مچ ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ اس امر کو پسند فرمائیں گے کہ بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نظریہ کے اسلام کا بھی دنیائے اسلام میں وہی حشر ہو جو اس سے پہلے عیسائیت کا یورپ میں ہو چکا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے، کہ ہم اسلام کو ایک اخلاقی نظریہ کی حیثیت سے تو باقی رکھیں۔ لیکن ایک نظام سیاست کی حیثیت سے اسکو رد کرکے اسکی جگہ وہ قومی (National) نظام ہائے سیاست اختیار کرلیں جن میں مذہب کو کسی قسم کی دخل دہی کی اجازت نہ ہو؟ یہ سوال ہندوستان میں ایک خاص اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یہ دعوی ایک یوروپین کی زبان سے

تعجب انگیز نہیں کہ مذہب ایک نجی اور انفرادی چیز ہے۔ یورپ میں عیسائیت کا تصور ایک کیشِ رہبانیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مادی دُنیا کو ترک کر کے تمام توجہات صرف روحانی دنیا پر مرکوز کر دی جائیں اس کیش کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔ جو مذکورہ بالا دعوی میں بیان کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے) لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات و کیفیات رُوحانی (Religioue experiences) کی جو نوعیت قرآن مجید سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کیفیات و واردات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ محض شخصِ متعلقہ کے قلب میں پیدا ہو کر صرف اسی پر اثر انداز ہوں اور اس کا معاشرتی ماحول ان سے کچھ بھی متاثر نہ ہو۔ یہ ایسی کیفیات ہیں کہ ان کا ہبط تو قلب انسانی ہو۔ لیکن اُن سے ایک پورا معاشرتی نظام وجود میں آجائے۔ ان کیفیات کا فوری ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اُن سے ایک خاص نظام تمدن کے اصول اساسی مرتب ہو جاتے ہیں جو آئینی تصورات (قوانین وضوابط) کا ایک جہان خاموش اپنے آغوش میں لئے ہوتے ہیں۔ اور جن کی تہذیبی اہمیت محض اس لئے کم نہیں ہو سکتی کہ ان کا ماخذ وحی الٰہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مذہب اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی نظام میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو رد کر دیا جائے تو دوسرا خود بخود رد ہو جاتا ہے۔ بنا بریں قومیت کے خطوط پر کسی ایسے نظام تمدن کی تعمیر جو وحدت اسلامی کے اصول سے متصادم ہوتا ہو۔ مسلمان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اس وقت براہ راست مسلمانان ہند کے درپیش ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ "انسان نہ تو اس کی نسل اور مذہب کا غلام بنایا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہی دریاؤں پہاڑوں کی حدود بندیاں اسے مقید کر سکتی ہیں۔ بلکہ صحیح الدماغ اور گرم جوش دل رکھنے والے انسانوں کی عظیم الشان اجتماعیت ایک اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے جسے "قوم" کہتے ہیں" اس قسم کی جماعتی ترکیب ناممکن نہیں۔ اگرچہ اس کے لئے ایک طول طویل اور زہرہ گداز مرحلہ طے کرنا پڑے گا۔ جس میں یوں کہیئے کہ انسانوں کو نئے قالب میں ڈھالنا اور انہیں تازہ جذبات سے مسلح کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان میں کبیر کی تعلیم اور شہنشاہ اکبر کا دین الٰہی عوام کی ذہنیت پر غالب آجاتا تو اس قسم کی قومیت اس ملک میں بھی قائم ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور اس کے مختلف مذہبی گروہوں میں

یہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اپنی اپنی انفرادی جزئیات کو ایک عظیم الشان "کل" میں فنا کر دیں۔ (اور یوں قطرات سمندر میں مل کر سمندر بن جائیں)۔ ہر گروہ اپنی جماعتی ہستی قایم رکھنے کے لیے بضد ہے۔ اس قسم کے اخلاقی شعور کا پیدا ہونا جو رینان کے نظریۂ قومیت کا اصل اصول ہے اتنی بڑی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے کہ اقوام ہند اسے ادا کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔ لہذا ہندوستان میں اتحاد قومی یہاں کی مختلف اقوام کے جداگانہ وجود کے انکار میں نہیں بلکہ ان سب کے تعاون اور ہم آہنگی میں تلاش کرنا چاہیئے۔ صحیح تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ حقایق خواہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں۔ ان سے چشم پوشی نہ کی جائے حصول مقصد کا عملی طریق یہ نہیں۔ کہ جس صورت حالات کا وجود ہی نہ ہو اسے خواہ مخواہ موجود فرض کر لیا جائے بلکہ یہ کہ حقایق جس انداز میں ہیں ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حتی الوسع بہترین استفادہ کیا جائے ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر حقیقتاً اسی بات پر منحصر ہے کہ ہندوستان میں اتحاد قومی کو ان ہی راستوں سے تلاش کیا جائے۔ ہندوستان بجائے خویش ایک چھوٹا سا "ایشیا" ہے۔ اس کے باشندوں کے ایک حصہ کا کلچر اقوام مشرق کے کلچر سے ہم آہنگ ہے۔ اور دوسرے حصہ کا کلچر وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے کلچر کے ساتھ اگر ہندوستان میں باہمی اشتراک عمل کا کوئی مؤثر اصول دریافت کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری ناقابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر کارگہ تاریخ میں اپنے محل وقوع کی وجہ سے مدت دراز تک مصیبت و ابتلاء کی آماجگاہ رہی ہے۔ امن و امان اور مصالحت باہمی کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں گی اور اس کے ساتھ ہی ایشیا بھر کی تمام سیاسی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یکجہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزوئیں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریق مقابل پر تغلب و تسلط حاصل کر لیا جائے۔ یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی

اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں اَنَا الْمَوْجُوْدُ لَا غَیْرِیْ کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے۔ بلند آہنگ دعاوی کو دیکھو تو حب الوطنی کی وسعت قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات" اور "قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشوونما کر سکے بہرحال ہماری ناکامی کے وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یکجہتی کے میلان کا پتہ دیتی ہے اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگ بنیاد تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنے اس وطن عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر اپنی نشوونما کر سکتے ہیں تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہو گا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے اور اس کے اقسام میں بین فرق پایا جاتا ہے۔ جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے۔ وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر۔ قوانین و ضوابط مذہبی و معاشرتی ادارات کا بیحد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی افتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب

اپنے لٹریچر۔ اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو قبال بنا دیا ہے۔ اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔ ملت پرستی کے اس بلند ترین پہلو کی قدر و قیمت کو تو نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ کہنا کہ فرقہ وار صوبوں کا وجود میں لانا قومیت پرستی کے وسیع نظریہ کے منافی ہوگا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ دنیا میں الگ الگ فرقوں کی ہستی بین الاقوامیت کے وسیع ترین تصور کے منافی ہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کا سرگرم سے سرگرم حامی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بین الاقوامی نظام حکومت اس وقت تک ناممکن بلکہ محال ہے جب تک ہر قوم مکمل طور پر خود مختار نہ ہو۔ اسیطرح جب تک مختلف فرقے اس باب میں بالکل آزاد نہ ہوں کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن (کلچر) کی بنیادوں پر اپنے نظام زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ ایک ہم آہنگ قوم کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اور یہ کسے یاد نہیں کہ جب فرقہ پرستی کسی بہتر جذبہ پر مبنی ہو تو وہی کلچر بن جاتی ہے"۔

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کیلئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یورپین ممالک کے۔ ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل۔ مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتی کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کو معرض وجود میں لایا جائے

دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے میرے نزدیک تو اُسکا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اسکے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انہیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریاتِ زندگی کے ماتحت اپنے جوہرِ مضمر کی نشو ونما کر سکیں۔ اور پھر ان صحیح عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ "کُل" تخلیق ہو۔ اور مجھے یقین واثق ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے اُن مطالبات کی پُرزور تائید کریگا، جو مذکورہ قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو اِن مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب صُوبۂ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملاکر ایک واحد ریاست قائم کیجائے (ہندوستان کو) حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے۔ یا اِس سے باہر کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی، لیکن اس نے اِسکو اِس بنا پر رَد کر دیا کہ اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو اس سے ایک ایسی ریاست معرضِ وجود میں آجائے گی جسکا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے کمیٹی کی یہ رائے صحیح ہے۔ لیکن بلحاظ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صُوبوں میں سے بھی چھوٹی ہوگی اگر قسمتِ انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہے اِس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائیگی۔ اور اِس میں مُسلمانوں کی آبادی کا تناسب بڑھ جائیگا۔ جب اس طرح غیر مسلم آبادی کا تناسب بہت کم رہ جائیگا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست اِس قابل ہو جائیگی کہ وہ اپنے علاقہ کے اندر رہنے والی اقلیتوں کو مؤثر تحفظات دے سکے۔ اِس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہیئے اور نہ ہی انگریز کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان دُنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی مُلک ہے۔ اِس مُلک میں اسلام حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسکے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا

جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اِس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جسکے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قایم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کردی جائے تو یہ آخرالذکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھادیگا اِس سے مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اور انکا جذبہ حب وطن اور بھی زیادہ ہوجائیگا جب اس طرح شمال مغرب کے مسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہونگے تو وہ ہر بیرونی حملے کے مقابلہ میں خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو یا شمشیر و سنان کا ہجوم ہندوستان کی بہترین مدافعت کرسکیں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصدی ہے لیکن ہندوستانی فوج کا چوتھائی فیصدی حصہ انہیں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر وہ انیس ہزار گورکھے علیحدہ کردیئے جائیں جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کیئے جاتے ہیں تو پنجاب کے فوجی سپاہیوں کی تعداد ساری ہندوستانی فوج میں باسٹھ فیصدی ہوجاتی ہے۔ اِس میں ابھی وہ چند ہزار سپاہی شامل نہیں ہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ اِس سے آپ بآسانی اندازہ لگاسکتے ہیں کہ ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستی سے محفوظ رکھنے کے لیے شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کررہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ اُنکے ہاتھ آجائے۔ میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتادینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کررہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اِس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقعہ ملے۔ اس لیئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اُس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جسکا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لیئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ بھی لاحق نہ ہونا چاہیئے

کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام سے مقصد یہ ہوگا کہ ان میں ایک قسم کے مذہبی نظام حکومت کی ترویج ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے متعلق جب "مذہب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام "خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ" کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جسکی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے اِس نظام کا تعین اُسوقت ہو چکا تھا۔ جبکہ دُنیا میں کسی رُوسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس نظام کی بُنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے۔ جسکی رُو سے انسان جمادات اور نباتات کیطرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اسکو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا۔ اور کبھی اُس سے، بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے۔ جس کی صحیح قدر و قیمت اُسوقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو، وہ اس مشینری کا ایک فعال پُرزہ ہوتا ہے اور اُسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لیے اُسپر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلامی نظامِ حکومت کی ماہیئت کو سمجھنے کے لیے "ٹائمز آف انڈیا" کا وہ مقالۂ افتتاحیہ پڑھنا چاہیئے جو جریدۂ مذکور نے آج سے کچھ عرصہ پیشتر انڈین بینکنگ انکوائری کمیٹی کے متعلق لکھا تھا۔ "ٹائمز" لکھتا ہے۔

> قدیم ہندوستان میں حکومت کیطرف سے شرح سود متعین کرنے کے لیے قوانین وضع ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب اس مُلک میں اسلامی حکومت قایم ہوئی تو اس شرح سود پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی، باوجودیکہ اسلام میں رقوم قرضہ پر سود لینا صاف طور پر ممنوع[1] قرار دیا گیا ہے۔"

---

[1] یعنی جو غیر مسلم سود کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی شرح سود پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ حالانکہ حکومت کے مذہب میں سود حرام تھا۔ (طلوع اسلام)

لہٰذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور مسلمانان ہند دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے، اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ اسلیے ملک میں امن وامان قایم ہو جائیگا۔ یہ تو ہندوستان کا فائدہ ہوگا۔ اور اسلام کو موقع ملیگا کہ اسپر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں۔ اُن سے مخلصی حاصل کرے۔ اور اپنے شرعی قوانین اپنی تعلیم اور اپنے کلچر کی تنظیم کرکے انہیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کی ضروریات سے قریب تر لاسکے۔

فیڈرل ریاستیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی۔ کہ چونکہ ہندوستان میں آب وہوا نسل۔ زبان معتقدات اور معاشرتی نظام میں گوناگوں اختلافات ہیں۔ اسلیے یہاں کسی محکم دستوری نظام کے لیے صرف ایک ہی صورت ہوسکتی ہے، اور وہ یہ کہ یہاں زبان۔ نسل۔ تاریخ مذہب کی وحدت اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت کی بنیادوں پر خود مختار ریاستیں قایم کیجائیں۔ سائمن رپورٹ نے فیڈریشن کا جو تصور قایم کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین انتخاب عام سے مرتب نہ کیجائے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے مختلف نمائندوں کی مجلس ہو۔ نیز سائمن رپورٹ میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ ملک کو مختلف علاقوں میں نئے سرے سے اُسی اصول پر تقسیم کیا جائے، جسکا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سائمن کمیشن کی اِن سفارشات کی مَیں پوری پوری تائید کرتا ہوں۔ لیکن اسکے ساتھ مَیں اس اضافہ کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ صوبوں کی جدید تقسیم دو شرطوں کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ اول یہ کہ یہ تقسیم جدید دستور کے نفاذ سے پہلے ہوجانی چاہیئے اور دوسرے اسکی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس سے آئے دن کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوجائے۔ اگر صحیح طریق پر صوبوں کی جدید تقسیم عمل میں آگئی تو ہندوستان کے آئینی مباحث میں سے جداگانہ اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا مسئلہ خود بخود معدوم ہو جائے گا۔ کیونکہ صوبجات کی موجودہ ترکیب ہی موجودہ مناقشات کی سب سے بڑی وجہ ہے، ہندو کا خیال ہے کہ

جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اُصول حقیقی قومیت پرستی کے منافی ہے، قومیت کا جو تصور اُسنے قایم کر رکھا ہے اُس سے مفہوم یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اور فرقے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ کہ کسی جماعت کا جُداگانہ انفرادی تشخص باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حالات موجود نہیں۔ اور نہ اُسکا ہونا مناسب ہے، ہندوستان مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسانوں کا مُلک ہے۔ اسکے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام اقتصادی پستی، تمام ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص اُنکا لاتعداد قرضہ، صوبوں میں اُن کی ایسی ناکافی اکثریت جو کسی وقت اقلیت میں بدلی جا سکتی ہے۔ اگر ان امور کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو آپ پر بالکل واضح ہو جائیگا کہ ہم جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لیئے اسقدر مضطرب کیوں ہیں؟ ایسے مُلک میں اور ایسے حالات کے ماتحت فیڈریشن میں اگر اقوام کی نمائندگی کی بجائے صُوبوں کی نمائندگی ہو تو اس سے ہر ایک طبقہ کے مفاد کی صحیح صحیح نمائندگی نہیں ہو سکے گی اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ زمامِ حکومت چند افراد کے ہاتھ میں (Oligarchy) رہے گی۔ ہاں! اگر موجودہ صوبجاتی تقسیم کی بجائے ہندوستان کی جدید تقسیم مختلف قوموں کی لسانی، نسلی تمدنی "کلچرل" اور مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر کر دی جائے تو مسلمانوں کو اسپر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ فیڈریشن میں بجائے مختلف اقوام کی نمائندگی کے مختلف علاقوں کی نمائندگی ہو۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل حکومت کے اختیارات کا تعلق ہے جو نظامِ حکومت "ہندوستانی پنڈتوں" (یعنی نہرو رپورٹ) اور "انگلستانی پنڈتوں" (یعنی سائمن رپورٹ) نے تجویز کیا ہے۔ اسکی پشت پر جو جذبات کارفرما ہیں۔ ان میں ایک ایسا باریک فرق ہے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ "ہندوستانی پنڈت" مرکز کو بحالتِ موجودہ قایم رکھنا چاہتے ہیں (یعنی وہ فیڈریشن کی بجائے یونیٹری (Unitary) کی شکل کی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام

صوبے مرکز کے ماتحت رہتے ہیں) انکی خواہش یہ ہے کہ حکومت کی باگ ڈور مرکزی اسمبلی کے ہاتھ میں ہو جسے وہ بصورتِ موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موجودہ نامزدگی (Nomination) کا سلسلہ ختم ہو جانے پر مرکزی اسمبلی میں اُن کی اکثریت اور بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہو جائے گی، برعکس اسکے چونکہ "انگلستانی پنڈت" یہ محسوس کرتے ہیں کہ مرکز کی جمہوریت اُنکے مفاد کے خلاف جائے گی۔ اور اگر ذمہ دار حکومت کے حصول کے لیئے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو جو اختیارات آج اُنکے ہاتھ میں ہیں۔ وہ بھی اُن سے چھن جائینگے۔ اسلیئے وہ جمہوری نظام کو مرکز کے بجائے صوبوں کی طرف منتقل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ بلاشبہ وہ فیڈریشن کے اُصول کی ترویج کر رہے ہیں اور چند تجاویز کی رُو سے اُنہوں نے اِسکا آغاز بھی کر دیا ہے۔ لیکن جن مقاصد کے پیشِ نظر وہ اس اصول کی قدر و قیمت متعین کر رہے ہیں وہ اُن مقاصد سے بالکل مختلف ہیں جنکے ماتحت ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں مسلمان فیڈریشن کا مطالبہ اسلیئے کرتے کہ اسکے ذریعہ سے ہندوستان کا مشکل ترین عُقدہ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو جائیگا۔ لیکن شاہی کمیشن (Royal commission) کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اُصولاً کتنا ہی درست و محکم کیوں نہ ہو اُن کی غرض و غایت یہ معلوم نہیں ہوتی کہ فیڈرل ریاستوں کو مکمل طور پر خود مختار کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے برطانیہ کے لیئے جو صورت حالات پیدا ہو گی۔ اُس سے بچاؤ کی کوئی شکل نکل آئے۔ انہیں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی کوئی فکر ہی نہیں اس لیئے وہ اسے جوں کا توں چھوڑ رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے۔ سائمن رپورٹ فیڈریشن کے اُصول کی اصلی ماہیئت کو ہی رَد کر رہی ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین اس چیز کو بھانپ کر کہ مرکزی اسمبلی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہو گی وحدتی نظامِ حکومت (Unitary form of Govt.) کی تجویز پر آگئے ہیں کیونکہ اس نظامِ حکومت کی رُو سے ہندوؤں کو سارے ہندوستان پر عام غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے گا

سائمن رپورٹ برائے نام فیڈریشن کے چلمنی پردہ کی آڑ میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اہل برطانیہ قدرتی طور پر اس اقتدار سے دستکش نہیں ہونا چاہتے جو انہیں آج تک حاصل رہا ہے اور کچھ اسلیئے کہ اگر ہندوستان کی مختلف اقوام میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو تو اہل برطانیہ کو بہانہ ملجاتا ہے کہ موجودہ طاقت اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں۔ جہاں تک وحدتی نظام حکومت کا تعلق ہے وہ تو میرے نزدیک آزاد ہندوستان میں قابلِ التفات ہی نہیں باقی رہی فیڈریشن تو وہ اِس قسم کی ہونی چاہیئے کہ اس میں باقیماندہ اختیارات Residuary Powers کلیتہً خود مختار ریاستوں کے ہاتھ میں رہیں اور مرکزی فیڈرل حکومت صرف انہی اختیارات کے استعمال کی اہل ہو جو مختلف آزاد ریاستیں اپنی رضامندی سے اسکی تحویل میں دیدیں میں مسلمانانِ ہند کو کبھی ایسے نظام کے منظور کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول ناپید ہو یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ملّی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے، خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو یا ہندی الاصل۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

مرکزی حکومت کی وضع و ہیئت میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس اغلباً اس سے بہت پہلے ہو رہا تھا جب کہ برطانیہ نے اس کے نفاذ کے موثر ذرائع اختیار کرنے کا خیال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اِس امر کا اعلان کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیانِ ریاست کی شرکت بھی نہایت ضروری ہے بہت دیر کے بعد کیا گیا۔ والیانِ ریاست کی طرف سے گول میز کانفرنس میں دفعتہً آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت پر آمادگی کا اظہار، اور اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو مندوبین کا جواب تک وحدتی نظامِ حکومت کے بالکل غیر متزلزل حامی چلے آتے تھے۔ خاموشی سے فیڈرل اسکیم کی ترتیب پر اظہار رضامندی باشندگان ہند کے لیئے علی العموم اور اقلیتوں کے لیئے علی الخصوص بڑا تعجب انگیز تھا حتیٰ کہ مسٹر شاستری نے

بھی جنہوں نے چند ہی روز قبل ہندوستان کے لئے فیڈرل سکیم کی سفارش کی پاداش میں سر جان سائمن پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی تھی۔ اپنی رائے بدل لی۔ اور اس تبدیلی رائے کا کانفرنس کے پہلے اجلاس عام میں اعتراف کیا اور اس طرح وزیر اعظم انگلستان کے لیے اپنی افتتاحی تقریر میں ایک نہایت برجستہ فقرہ چست کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔

انگریزوں کی یہ خواہش کہ والیانِ ریاست آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہو جائیں اور ہندوؤں کا یہ اقدام کہ انہوں نے فیڈرل حکومت کو بلا تامل منظور کر لیا خالی از علت نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ والیانِ ریاست جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل ہے کے فیڈریشن میں شامل ہونے سے دو نتیجے بالکل عیاں ہیں۔ یعنی یہ چیز ایک طرف تو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے علیٰ حالہٖ استحکام اور اور استبقار کا بڑا عمدہ ذریعہ بن جائے گی۔ اور دوسری طرف آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ہندوؤں کو ایک زبردست اکثریت حاصل ہونے کا موجب ہوگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرکزی حکومت کی آخری وضع و ہیئت کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو برطانوی مدبرین نہایت شاطرانہ انداز سے والیانِ ریاست کے مہروں کی وساطت سے اپنی مطلب برآری کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ ادھر والیانِ ریاست کو اس سکیم میں اپنی مطلق العنان حکومت کے برقرار رکھنے کے بہتر امکانات نظر آ رہے ہیں۔

اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ایسی سکیم کو منظور کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اس طرح وہ اپنی جداگانہ ملی ہستی کی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالیں گے۔ ہندوستان میں اس وضع کی فیڈرل حکومت کی پالیسی حقیقتاً ہندو والیانِ ریاست کے ہاتھ میں ہوگی۔ کیونکہ مرکزی فیڈرل اسمبلی میں انہی کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی اور وہ ان تمام معاملات میں جن کا تعلق برطانوی شہنشاہیت سے ہوگا۔ تاج برطانیہ کی پوری پوری حمایت کرینگے۔ اور جہاں تک اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے

تسلط اور اقتدار کو برقرار رکھنے اور اسے اور زیادہ مستحکم کرنے میں ہر طرح کی مدد دیں گے
بہ الفاظ دیگر اس سکیم کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم اور ہندوانڈیا
میں ایک ایسا سودا ہو جائے جس کی رو سے ہندو ہندوستان میں
انگریز کے وجود کو دائمی بنا دیں اور انگریز اس کے صلہ میں ہندوستان
میں ہندوؤں کو ایک ایسا نظام حکومت عطا کر دیں جس میں تمام دیگر
اقوام ہندوؤں کی مستقل غلامی کے پھندے میں جکڑی رہیں۔ لہذا اگر
برطانوی ہند کے صوبوں کو حقیقی معنوں میں خود مختار ریاستوں میں متشکل نہ کیا گیا تو ہندوستان
کی فیڈریشن میں والیانِ ریاست کی شمولیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھا جائے گا کہ
انگریز اپنے خاص شاطرانہ انداز میں ایسی چال چلنا چاہتا ہے کہ اپنے
ہاتھ سے کچھ نہ جائے۔ اور ہر ایک کو خوش بھی کر دیا جائے یعنی مسلمان
کو فیڈریشن کے لفظی کھلونے سے۔ ہندو کو مرکز میں اکثریت سے اور
برطانوی ملوکیت کو خواہ وہ ٹوری 'Tory' ہوں یا لیبر (Labourites)
حقیقی اختیارات کی تفویض سے۔ ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد
مسلم ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ برطانوی ہند
اور ریاستوں کے نمائندوں سے مرکب مرکزی ایوان (House) یا ایوانوں Houses
میں مسلمانوں کے تینتیس ۳۳ فی صدی مطالبہ کو کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
فیڈریشن کی جس سکیم پر گول میز کانفرنس میں بحث ہوئی ہے مسلم مندوبین اس کے
متعلقات سے پورے طور پر آگاہ ہیں۔ مجوزہ آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت
کا مسئلہ ابھی تک زیر بحث نہیں آیا۔ ریوٹر نے ملخصاً لکھا ہے۔

"فیڈرل کمیٹی کی سفارشات کے مسودہ (Interim report) میں دو ایوانوں
کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ دونوں میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے

شریک ہوں گے۔ ان کے تناسب کے معاملہ پر بعد میں فیڈرل سب کمیٹی ان عنوانات کے زیر نظر غور کرے گی جو ابھی اس کمیٹی کے لئے متعین نہیں کئے گئے۔"

میری رائے میں تناسب کا معاملہ بے حد اہم ہے اور اس پر اسمبلی کی وضع و ہیئت کے ساتھ ہی غور ہونا چاہیئے تھا۔ میرے خیال میں بہترین طریق کار یہ تھا۔ کہ سر دست صرف برطانوی ہند کے صوبوں کی فیڈریشن بنائی جاتی ہے۔ فیڈریشن کی جس سکیم کا آغاز جمہوریت (صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے) اور استبداد (ریاستوں کے نامزدہ نمائندے) کے غیر مقدس اتحاد سے ہوگا۔ اس سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستان وحدتی نظام حکومت کے گورکھ دھندے میں الجھا رہے۔ یہ وحدتی نظام انگریزوں کے لئے۔ برطانوی ہند کی سب سے بڑی قوم کے لئے (یعنی ہندوؤں کے لیئے) اور والیانِ ریاست کے لئے بہت سے فوائد کا سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن **مسلمانوں کو اس سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اختیارات (یعنی باقیماندہ اختیارات** Residuary Powers **فیڈریشن کے بجائے صوبوں کی تحویل میں ہوں) کے ساتھ اکثریت حاصل نہ ہو جائے** نیز فیڈرل اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد میں سے ایک تہائی نشستیں نہ مل جائیں۔ جہاں تک برطانوی ہند کے صوبوں کو مکمل اختیارات تفویض کرنے کا تعلق ہے۔ اعلیحضرت نواب صاحب بھوپال۔ سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا مطالبہ نہایت مستحکم بنیادوں پر مبنی ہے۔ چونکہ اب والیانِ ریاست بھی ہندوستانی فیڈریشن میں شامل ہو رہے ہیں اس لئے برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نیابت کے مسئلہ پر از سر نو غور ہونا چاہیئے۔ اب سوال صرف برطانوی ہند کی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمایندگی کا نہیں۔ بلکہ تمام ہندوستان کی فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کی نیابت کا

ہے۔ اب ہمارا یہ مطالبہ یوں پیش ہونا چاہیئے کہ ہمیں آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں دیجائیں اور فیڈریشن میں شامل ہونے والی مسلم ریاستوں کی نمائندگی کو اس ایک تہائی سے علٰحدہ رکھا جائے۔

مسئلہ دفاع (Defence)

ایک اور مشکل مسئلہ جو ہندوستان میں فیڈریشن کو کامیابی سے چلانے کے راستہ میں مزاحم ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام خامیوں کو ابھار کر سامنے لا کھڑا کیا ہے تاکہ فوج کے نظم و نسق کی باگ ڈور حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کر سکیں۔ ارکان کمیشن لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے دفاع کو اس وقت یا مستقبل قریب میں ایسا مسئلہ نہیں قرار دیا جا سکتا جس کا تعلق خالصتہً ہندوستان سے ہو۔ فوج پر کامل اختیارات ملک معظم کی حکومت کے کارندوں کے ہونگے اور وہی اس کا نظم و نسق کرینگے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ صورت حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ ہند میں ذمہ دار حکومت کی طرف پیش قدمی کا دروازہ اسوقت تک بند سمجھا جائے جب تک ہندوستان برطانوی افسروں اور برطانوی فوجوں کی امداد کے بغیر اپنی مدافعت کا پورا اہل نہ بن جائے۔ بحالاتِ موجودہ آئینی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ تو ضرور موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق اس امر پر اصرار کیا جائے کہ کسی آئندہ تغیر و تبدل

میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فوج کا نظم و نسق منتخب مجلس وضع قوانین کی تحویل میں چلا جائے۔ تو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ جو امیدیں بندھ رہی ہیں کہ مرکزی حکومت ارتقائی منازل طے کر کے اس نصب العین تک پہنچ جائے جس کا ذکر ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کیا گیا ہے۔ وہ ایک غیر معین مدت تک کے لئے دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

اپنی اس دلیل کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے ارکانِ کمیشن نے اس بات پر بھی زور دیا ہے۔ کہ ہندوستان میں ایسے مذاہب موجود ہیں جو ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ایسی قومیں موجود ہیں جن کی قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جن میں باہمی چشمک ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور ارکان کمیشن نے یہ کہہ کر مسئلہ کو بالکل لاینحل بنانے کی کوشش کی ہے کہ

"یہ حقیقت کہ ہندوستان عام محاورہ کے مطابق ایک واحد قوم (Nation) نہیں ہے۔ کہیں اتنی ابھر کر سامنے نہیں آتی جتنی اس خیال کو پیش نظر رکھنے سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی عسکری اور غیر عسکری اقوام میں کتنا بڑا فرق ہے۔"

کمیشن نے مسئلہ کے ان پہلوؤں کو اس شد و مد سے بیان کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انگریز ہندوستان کو محض بیرونی خطرات ہی سے محفوظ نہیں کر رہے بلکہ اس کے اندرونی امن و سکون کے بھی غیر جانبدار محافظ ہیں۔

فیڈریشن کا جو نظام میرے ذہن میں ہے اس کی رو سے ہندوستان میں فیڈریشن کے نافذ ہو جانے کے بعد صرف بیرونی حفاظت ہی کا سوال باقی رہ جائے گا۔ تمام صوبوں میں داخلی امن کے قیام کے لئے لازماً فوجیں موجود ہوں گی۔ ان کے علاوہ ہندوستان کی فیڈرل کانگریس۔ ہندوستان کی شمال و مغربی

سرحد پر ایک طاقت ور سرحدی فوج متعین کر دے گی جس میں عام صوبوں کے دستے شامل ہوں گے اور تمام قوموں کے قابل و کارواں فوجی افسروں کے ہاتھ میں ان کی قیادت ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں اس وقت قابل فوجی افسر موجود نہیں ہیں اور کمیشن کے ارکان نے اسی امر واقعہ کو پیش کر کے نظم و نسق فوج کو ملک معظم کی حکومت کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے وجہ جواز پیدا کی ہے۔ اس معاملے کے متعلق میں سائمن رپورٹ سے ایک اور اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میری رائے میں کمیشن کی اختیار کردہ پوزیشن کے خلاف ایک محکم دلیل ہے۔ رپورٹ مظہر ہے کہ:-

"جن ہندوستانیوں کو ملک معظم کی طرف سے شاہی کمیشن ملا ہوا ہے۔ ان میں سے کسی کو بہ حالاتِ موجودہ کپتانی سے اونچا فوجی منصب حاصل نہیں ہماری معلومات کے مطابق اس وقت ۳۹ کپتان ہیں جن میں سے ۳۵ عام رجمنٹوں میں مامور ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اتنی ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات پاس بھی کر لیں تو بھی پنشن پانے سے پیشتر کپتانی سے اونچا عہدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسے ہیں جنہوں نے سینڈ ہرسٹ کے فوجی کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ جنگِ عظیم میں انہیں کمیشن مل گئے۔ جب حالت یہ ہے تو تغیر کی حالت کتنی ہی مخلصانہ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کتنی ہی سرگرم کیوں نہ ہو ظاہر ہے کہ نشوونما ارتقا کی رفتار بہت سست اور مدھم رہے گی اس سلسلے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ان حالات کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ جو سکین کمیٹی نے (جس کے ممبر سب دیسی شرفاء تھے) ان موثر الفاظ میں بیان کئے ہیں کہ "ترقی بہر حال اس امر پر موقوف ہوگی کہ ہر مرحلہ میں کامیابی حاصل کیجائے اور فوجی صلاحیت کو برقرار رکھا جائے" موجودہ ہندوستانی افسر تمام کے تمام چھوٹے درجے کے ہیں اور ان کا تجربہ بہت محدود ہے ان میں سے اونچے درجے کے افسر قلیل مدت میں پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ جب تک افسروں کے درجے میں موزوں ہندوستانیوں کی بھرتی کی تعداد میں معتد بہ اضافہ نہیں ہوگا (اور ہم انکی تعداد میں اضافہ کے دل سے خواہاں ہیں)

جبتک ہندوستانیوں کی کافی تعداد تعلیم و تجربہ حاصل کرکے اس قابل نہیں ہوجائیگی کہ کم از کم چند ہندوستانی رجمنٹوں کے سارے عہدے سنبھال سکیں۔ جب تک ایسے دستے اپنی صلاحیت کا پورا علی ثبوت نہ دینگے۔ جب تک ہندوستانی افسر کامیاب فوجی خدمت کے ذریعہ اعلیٰ کمان کے قابل نہیں بن جائینگے اسوقت تک یہ پالیسی کہ تمام فوج ہندوستانی افسروں پر مشتمل ہو بروئے کار نہیں لائی جاسکتی۔ پھر بھی اس سکیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے سالہا سال درکار ہوں گے۔"

اب میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ بیماری عسکری اقوام کی فطری ناقابلیت کا نتیجہ ہے یا فوجی تعلیم دینے کی سستی رفتار کا؟ ہماری عسکری اقوام کی فوجی صلاحیت ناقابل انکار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ فوجی تعلیم کے لئے دوسری تعلیمات کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہو۔ میں فوجی معاملات کا ماہر نہیں ہوں کہ اس چیز کا صحیح اندازہ کرسکوں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے میں محسوس کرتا ہوں کہ مذکورہ استدلال کے مطابق یہ لائحہ عمل تو ایک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہے کہ ہندوستان ہمیشہ کے لئے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی فوج کے مسئلہ کو ایک ایسی کمیٹی کے حوالے کردیا جائے جس کے عناصر ترکیبی کا فیصلہ باہمی سمجھوتے سے کرلیا جائے۔ اگر یہاں فیڈرل حکومت قائم ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ اسلامی ریاستیں ہندوستان کی حفاظت کے لئے ایک غیر جانب دار ہندوستانی فوج اور غیر جانب دار ہندوستانی بحری طاقت کی تعمیر پر بصد خوشی رضامند ہوجائیں گی۔ مغلوں کے عہد میں اس قسم کی غیر جانب دار دفاعی فوج موجود تھی بلکہ اکبر کے زمانے میں سرحد ہند کی محافظ فوج کے تمام جرنیل ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ فیڈرل حکومت کے ماتحت غیر جانب دار ہندوستانی فوج کی سکیم کے پیش نظر مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کے یہ شکوک بھی بالکل رفع ہوجائیں گے۔ کہ مسلمانانِ ہند بیرونی حملے کی صورت میں اپنے ماورائے سرحد کے مسلمانوں کے ساتھ ملجائیں گے

دوسری شکل

میں نے اختصار کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو میری رائے میں اس ملک کے دو نہایت اہم آئینی مسئلوں کے متعلق کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کا اہم مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ازسرنو اس انداز پر تقسیم کی جائے کہ اس سے فرقہ وارانہ مسئلہ کا مستقل طور پر حل ہو جائے (یعنے صوبوں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ ان میں ہر قوم کو اپنی تہذیب کے مطابق اپنی نشوونما میں کامل آزادی حاصل ہو) لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ قابل التفات نہ سمجھا جائے تو میں پورے زور کے ساتھ اُن اسلامی مطالبات کی تائید کرتا ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی طرف سے بار بار پیش کئے جا چکے ہیں۔ مسلمانان ہند کسی ایسے آئینی تغیر پر ہرگز رضامند نہیں ہو سکتے جو جداگانہ انتخاب اور پنجاب اور بنگال میں ان کے حقوق اکثریت پر اثر انداز ہو یا اس امر کی ضمانت نہ دے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ان کی نیابت ایک تہائی یقینی طور پر ہو گی۔ مسلمانوں کے سیاسی رہنما اس سے پہلے دو موقعوں پر غلطی کھا چکے ہیں۔ اول میثاق لکھنؤ جس کی تخلیق ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کے غلط نظریہ کے ماتحت کی گئی اور جس کی رُو سے مسلمانان ہند کے سیاسی اقتدار کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ دوسرے وہ کوتاہ نگہی جو پنجاب کے مسلمانوں کی دیہاتی Rural اور شہری Urban تقسیم کا موجب بنی۔ اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یوں پنجاب کے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل گئی۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق لکھنؤ اور مسلمانانِ پنجاب کے دیہاتی اور شہری تقسیم کی تجویز کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانان پنجاب اور بنگال کے لئے آئینی اکثریت Statutory Majority کی سفارش نہیں کی اور اس طرح مسلمانوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے۔ اور یوں مسلمانوں کے لئے اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ وہ یا تو میثاق لکھنؤ پر قانع رہیں یا مخلوط انتخاب کی سکیم منظور کریں۔

سائمن رپورٹ کے متعلق حکومت ہند کے خریطہ Despatch میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ رپورٹ شائع ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں نے ان تجاویز میں سے کسی ایک کے قبول کرنے کے متعلق بھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ حکومت ہند نے اس خریطہ میں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو حقوق اکثریت سے اس بنا پر محروم کر دینا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ ان میں انہیں زائد نشستیں Weightage دی گئی ہیں مسلمانوں کے لئے جائز شکایات کا موجب ہوگا لیکن اس کے باوجود حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کی اس مجوزہ بے انصافی کی کوئی تلافی نہیں کی۔ بہرنوع لارڈ اِرون اور اُن کی حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ اکثریت کے لئے فرقہ وارانہ نیابت اس وقت تک باقی رہنی چاہیئے جب تک کہ حق رائے دہندگی Franchise کو اتنا وسیع نہ کر دیا جائے کہ اس سے ہر قوم کے ووٹ دینے والوں کی تعداد کا تناسب قریب قریب وہی ہو جو ان کی کل آبادی کا تناسب ہے، اور دوسرے جب تک صوبہ کی مجلس مقننہ کے مسلم ارکان دو تہائی اکثریت کے ساتھ جُداگانہ انتخاب سے دست برداری پر رضامندی کا اظہار نہ کریں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ باوجودیکہ حکومت ہند مسلمانوں کی شکایات کو حق بجانب تسلیم کرتی ہے، پھر بھی اس کو یہ ہمت کیوں نہیں پڑتی کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو آئینی اکثریت دینے کی سفارش کرے

مسئلہ سندھ

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسے نظام پر رضامند نہیں ہو سکتے جس میں سندھ کو ایک مستقل صوبہ نہ بنایا جائے اور صوبہ سرحد کی سیاسی حیثیت دوسرے صوبوں کے برابر نہ کر دی جائے۔ مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ سندھ کو بلوچستان کے ساتھ ملا کر ایک مستقل صوبہ کیوں نہ بنا دیا جائے سندھ اور احاطہ بمبئی میں تو کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی خود ارکان کمیشن اعتراف کرتے ہیں کہ طریق بود و ماند اور تمدن کے اعتبار سے سندھ ہندوستان کی بجائے عرب اور عراق سے زیادہ قریب ہے مشہور مسلم جغرافیہ دان مسعودی نے اس حقیقت کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ "سندھ ایک ایسا ملک ہے جسے ہندوستان کی بجائے ممالک اسلامیہ سے زیادہ قرب حاصل ہے"۔ روایت ہے کہ اُمیہ خاندان کے پہلے حکمراں نے مصر کے متعلق کہا تھا کہ "اس کی پُشت

افریقہ کی طرف ہے اور منہ عرب کی طرف " ضروری ترمیمات کے ساتھ یہی قول سندھ کی اصلی پوزیشن کو بھی واضح کر دیتا ہے۔ مصر کی طرح سندھ کی بھی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی طرف۔ علاوہ بریں جب ہم سندھ کے زراعتی وسائل اور معاملات پر غور کرتے ہیں جو اپنے متعلق حکومت بمبئی کے دل میں کبھی جذبات ہمدردی پیدا نہیں کر سکتے۔ نیز جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ کراچی لازماً نشو و ارتقا پا کر ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا تجارتی شہر بن جائیگا اور اس سے سندھ کی تجارت میں لامتناہی ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں گے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ سندھ کو احاطہ بمبئی کے ساتھ وابستہ رکھنا تدبر اور دور اندیشی کے منافی ہے، کیونکہ اگرچہ آج ان دونوں کے درمیان بہ ظاہر کش مکش نہیں لیکن مستقبل قریب میں ان کے درمیان جذبات رقابت پیدا ہونے کے بہت امکانات ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ علیحدگی سندھ کے راستہ میں مالی مشکلات حائل ہیں اس مسئلہ کے متعلق آج تک میرے سامنے کوئی قطعی اور مستند بیان نہیں آیا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ واقعی اس قسم کی مشکلات موجود ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند ایک ہونہار صوبہ کو مستقل نشو و ارتقا کی جدوجہد میں عارضی طور پر مالی امداد دینے کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہوتی۔

صوبہ سرحد

صوبہ سرحد کے متعلق یہ دیکھ کر بے حد قلق ہوتا ہے کہ ارکان کمیشن نے اس امر سے انکار ہی کر دیا ہے کہ اس صوبہ کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا کوئی حق حاصل ہے۔ کمیشن نے صوبہ سرحد کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بے Bray کمیٹی کی تجاویز سے بھی کم ہیں اور اس صوبہ کیلئے جو کونسل تجویز کی گئی ہے اسے چیف کمشنر کی مطلق العنانی کو چھپانے کے لئے ایک نظر فریب پردے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ افغان کے سگریٹ سلگانے کا فطری حق محض اس لئے چھین لیا گیا ہے کہ وہ اتفاق سے بارودخانہ Powder House میں مقیم ہے۔ ارکان کمیشن کا یہ تمثیلی استدلال بہ ظاہر کتنا ہی خوش آیند کیوں نہ ہو لیکن ہے بیحد ناقابل اطمینان۔ سیاسی اصلاحات کو "روشنی" کہنا چاہیئے نہ کہ "آگ" اور روشنی کا ہر انسان حق دار ہے خواہ وہ بارودخانہ کے اندر مقیم ہو یا کوئلہ کی کان میں۔ افغان بہادر ہے، بالغ نظر ہے اور اپنے جائز حقوق کے لئے ہر تکلیف برداشت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس لئے اسے کامل خود اختیاری حکومت کے مواقع سے محروم کرنے کی

جو کوشش کی جائے گی وہ یقیناً اس کی برافروختگی کا باعث ہوگی۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ اس قوم کو مطمئن رکھا جائے۔ حال ہی میں اس بدنصیب صوبے میں جو الم انگیز واقعات پیش آچکے ہیں وہ اسی ناروا سکون کا نتیجہ ہیں، جو ہندوستان میں خود اختیاری حکومت کا اصول نافذ کرنے کے وقت سے اہل سرحد کے ساتھ روا رکھا گیا۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صوبہ سرحد کی موجودہ بے چینی کو بیرونی اسباب کا نتیجہ قرار دے کر صورت حالات کے صحیح اندازہ سے چشم پوشی نہیں کرینگے۔

صوبہ سرحد کے متعلق حکومت ہند کے خریطہ میں جو سفارشات کی گئی ہیں۔ وہ بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس خریطہ میں ایک نام نہاد مجلس نمائندگان اور ایک نیم نمائندہ Semi-representative سی کابینہ مہیا کرکے سائمن رپورٹ کی سفارشوں پر اضافہ کردیا گیا ہے لیکن یہ محض اشک شوئی ہے کیونکہ اس اہم ترین مسلم صوبے کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی سطح پر نہیں لایا گیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ افغان فطرتاً ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں جمہوری ادارات کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

گول میز کانفرنس

میرا فرض ہے کہ اب میں گول میز کانفرنس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ ذاتی طور پر گول میز کانفرنس کے نتائج کے متعلق میری توقعات کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہیں۔ امید تو یہ تھی کہ فرقہ وارانہ مناقشات کی کشمکش گاہ سے دور نئی فضا زیادہ بصیرت افروز ہوگی۔ اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں اختلاف کا مخلصانہ تصفیہ آزادی ہند کے مقصد کو قریب تر لے آئیگا۔ لیکن واقعات کچھ اور ہی داستان سنا رہے ہیں لندن میں فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق جو بحث و تمحیص ہوئی اس سے یہ حقیقت کہ ہندوستان میں ان دو بڑی تہذیبوں کی حامل اقوام میں کس قدر اصولی اختلافات موجود ہیں اس انداز سے عریاں ہوگئی کہ اس سے پیشتر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ اس کے باوجود وزیر اعظم انگلستان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی مسئلہ نہیں۔ بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بیان کیا جاتا

ہے کہ وزیر اعظم نے کہا کہ "میری حکومت کے لئے یہ مشکل ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کے حق میں تجاویز پیش کر سکے۔ اس لئے کہ مخلوط انتخاب کے اصول کو برطانیہ کے خیالاتِ جمہوریت کے ساتھ زیادہ مطابقت حاصل ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وزیر اعظم انگلستان نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ایک ایسی سرزمین میں جہاں مختلف قومیں آباد ہوں برطانوی جمہوریت کے نمونہ پر کوئی نظام حکومت قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس نے یہ بھی نہیں سمجھا (کہ مخلوط انتخاب تو ایک طرف) خود جداگانہ انتخاب بھی اس تجویز کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو تہذیبی خطوں کے مطابق صوبوں کی از سرِ نو تقسیم پر مشتمل ہے۔ اقلیتوں کی سب کمیٹی میں بھی اطمینان بخش تصفیہ کی کوئی اُمید نہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام کا تمام مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے ہو اور ہمارا خیال ہے کہ تیز بین برطانوی مدبرین اکثر ہندوستانی سیاست دانوں کی طرح اس مسئلہ کو سطحی نظر سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اس کی گہرائیوں میں اُتر کر ہندوستان جیسے ملک میں امن و سکون کے صحیح اصول و مبانی کا واضح طور پر مشاہدہ کر لیں گے۔ ہندوستان کے لئے نظامِ حکومت کی بنیادیں "متحدہ قومیت" کے غلط تصور پر رکھنا یا یہاں ان اصولوں کو ٹھونسنا جو برطانیہ کے انداز جمہوریت کے رہین منت ہوں، ہندوستان سے دوستی نہیں بلکہ اسے نادانستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ **جہاں تک میری بصیرت کام دیتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف اقوام کو ایسے مواقع بہم نہ پہونچائے جائیں کہ وہ اپنے ماضی کے شجرِ مقدس سے پیوستہ رہتے ہوئے عصرِ حاضر کے داعیات کے مطابق خود مختارانہ اپنی ملّت کی نشو و نما کر سکیں۔**

مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے مسلم مندوبین اس مسئلہ کو صحیح اصول پر حل کرنے کی اہمیت سے پورے طور پر آگاہ ہیں۔ جسے میں نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے وہ اس بات پر زور دینے میں بالکل حق بہ جانب ہیں کہ مرکزی حکومت میں خود مختارانہ حکومت کے مسئلہ سے پیشتر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ کسی مسلم سیاست دان کو فرقہ پرستی Communalism کے طنز سے گھبرانا نہیں

چاہیئے جسے اغیار نے محض مخالفانہ پروپیگنڈہ کے لئے اختیار کیا ہے اور اسے اس غرض سے ایجاد کیا گیا ہے کہ اہل برطانیہ کے جذبات جمہوریت کو اپیل کر کے اپنا اُلّو سیدھا کیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں جس چیز (متحدہ قومیت) کا وجود ہی نہیں اسے انگلستان کو باور کرا کر اُسے خواہ مخواہ غلط راستہ پر لگا دیا جائے۔ اس وقت سر دھڑ کی بازی لگ رہی ہے۔ ہم تعداد میں بھی سات کروڑ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی دوسری قوم ایسی نہیں جو ہماری طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس پر صحیح معنوں میں موجودہ زمانے کے مفہوم کے مطابق لفظِ قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندو ہم سے ہر اعتبار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان میں آج تک وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جو منتشر افراد کو ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے لابدی ہے اور جو آپ کو اسلام کی بارگاہ سے بلا مزد و قیمت بطور عطیہ کے مل گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج ہندو ایک قوم بننے کے لئے بے حد مضطرب اور بے تاب ہیں۔ لیکن افراد کو قوم بننے کے لئے ایسے ہی دشوار گذار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ جیسے قطرے کو گوہر بننے کے لئے۔ اور ہندو تو اس وقت تک ایک قوم بن ہی نہیں سکتے۔ جب تک کہ وہ اپنے تمام موجودہ معاشرتی نظام کو یکسر بدل نہ ڈالیں۔ نہ ہی مسلمان لیڈروں اور سیاست دانوں کو اس قسم کے عیارانہ اور گمراہ کن استدلالات کی رو میں بہ جانا چاہیئے کہ ترکی اور ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ کے باشندے قومی یعنی جغرافیائی نظریات کے ماتحت ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات بالکل مختلف ہیں، ہندوستان سے باہر کے اسلامی ممالک میں قریب قریب تمام آبادی مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی اقلیتیں بہ اصطلاح قرآن کریم "اہل کتاب" پر مشتمل ہیں اور اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاشرتی بندش نہیں ہے۔ کوئی یہودی یا عیسائی یا اہل زرتشت اگر مسلمان کے کھانے کو چھو دے تو اس کا کھانا بھرشٹ نہیں ہو جاتا اور اسلامی شریعت میں اہل کتاب کی عورتوں کیساتھ شادی بھی جائز ہے۔ اسلام نے تمام نوع انسانی میں ایک وحدت پیدا کرنے کے لئے پہلا عملی قدم یہ اُٹھایا کہ ان لوگوں کے آگے بڑھنے اور اتحاد پیدا کرنے کی دعوت دی جن کا اخلاقی نصب العین اسلام کے نصب العین سے قریب تر تھا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے

يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تعالوا اِلٰى كَلِمَةٍ سواءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

اے اہل کتاب آؤ اس حقیقت پر متحد ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام اور عیسائیت کی جنگوں نیز اہل یورپ کی مختلف النوع چیرہ دستیوں نے اس آیۂ مقدسہ کے لامتناہی مفہوم کو دنیائے اسلام میں عملی جامہ پہننے کا موقعہ نہ دیا۔ آج اسلامی ممالک میں اس حسین خواب کی تعبیر اس رنگ میں ہو رہی ہے جسے "اسلامی قومیت" کہا جاتا ہے۔

میرے لئے یہ عرض کرنا چنداں ضروری نہیں کہ ہمارے نمائندے جتنے زیادہ اس بات میں کامیاب ہوں گے کہ وہ غیر مسلم نمایندوں کو ہمارے "دہلی ریزولیوشن" کے مطالبات کو تسلیم کرنے پر رضامند کر لیں۔ اتنی ہی ان کی کامیابی زیادہ سمجھی جائے گی۔ اگر یہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو پھر قوم کے لئے موت اور حیات کا سوال درپیش ہوگا۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر متحدہ طور پر عملی قدم اُٹھائیں۔ اگر آپ سچ مچ اپنے مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو اس متحدہ عمل کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے۔ اکابر ملت سیاسی معاملات کے متعلق کافی غور و تدبر کر چکے ہیں۔ جس نے ہمارے دلوں میں ان قوتوں کا کم و بیش احساس ضرور پیدا کر دیا ہے۔ جو اس وقت ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کی تقدیروں کو سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اُنہوں نے ہمیں اس عملی قدم کے لئے بھی تیار کر دیا ہے جس کے لئے مستقبل میں رونما ہونے والے حالات متقاضی ہوں گے۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ دور حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ پہلی مصیبت قحط الرجال کی ہے۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی یہ تشخیص بالکل صحیح تھی کہ مسلم قوم میں رہنماؤں کا فقدان ہے جیسا کہ اُنہوں نے علی گڈھ یونیورسٹی کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ لیڈروں سے میری مُراد ایسے حضرات ہیں جنہیں مبدا فیض کی کرم گستری یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اس کے منتہائے نگاہ کے متعلق بصیرت تامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصر حاضرہ کے

تاریخی شواہد بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں ہوتے ہیں جو قوم کے عروق مردہ میں خون زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ جسے چاہے دے۔ حسب فرمائش ہوائے نہیں جا سکتے۔ دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے یہ ہے کہ ان کے دل سے احساس اجتماعیت فنا ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے الگ الگ راستوں پر گامزن ہو رہے ہیں اور ان کا کوئی کام ملت کے اجتماعی افکار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہونچاتا۔ ہم آج میدان سیاست میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو نقصان نہیں پہنچاتے ان جھگڑوں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصل اصول (مذہب) جو ہماری اجتماعیت کا نقطۂ ماسکہ ہے اس سے ہمیں گہری دلچسپی ہے۔ پھر یہ اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے۔ لیکن سیاسیات کے دائرے میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جب کہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحاد عمل پر ہو قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم ان ہر دو مصیبتوں کا علاج کیا کریں۔ پہلی مصیبت (یعنی صحیح رہنماؤں کا فقدان) کا علاج تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔ البتہ دوسری مصیبت (عدم احساس اجتماعیت) میرے خیال میں ناقابلِ علاج نہیں۔ اس باب میں میرے سامنے ایک منظم لائحہ عمل موجود ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک وہ مزعومہ خطرہ پیدا نہ ہو جائے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ صورت حالات پیدا ہو جائیں تو اس وقت ضرورت ہو گی کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے ممتاز اکابر ملت ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس لئے نہیں کہ ریزولیوشن پاس کئے جائیں۔ بلکہ اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے آخری طریق کار متعین کیا جائے، اور انہیں حصول مقاصد کا عملی راستہ بتایا جائے۔ میں نے اس خطبہ میں اس دوسری شکل کا تذکرہ صرف اسلئے کر دیا ہے کہ آپ اسے اپنے پیش نظر رکھیں اور اس دوراں میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔

خاتمۂ سخن ۔ حضرات! مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ خاتمہ پر میں اس امر کی اہمیت واضح

کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آج آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملّتِ اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ہوگی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے اور اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے۔ اور اس سرزمین کو اظہارِ خودی کی اس مسرت سے یکسر محروم کر دیا ہے جس کی برکت سے یہ کبھی ایک عظیم الشان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین (یعنی ہندوستان) کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیا کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا۔ بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالم اسلامی پر کیا اثر ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان سے ہم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کر لیں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملّی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں، متحد ہوں۔ ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملّت کی موت اور زندگی وابستہ ہے۔ بہت بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وار مسائل میں سمجھوتہ کی طرف سے ناامید نہیں ہوں، لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم کو ایک

متحدہ نصب العین پر مرکوز کئے ہوئے ہوں ۔ اچھا تو کیا اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ مسلمانوں میں اس قسم کی وحدتِ افکار پیدا ہو سکے ۔ ہاں یہ ممکن ہے ۔ اس کے لئے طریق عمل یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو پارٹی بازی کے محدود مفاد اور ذاتی اغراض کی سطح سے بلند کرلیں اور اس بلند ترین نصب العین کی روشنی میں جس کی نیابت کے لئے دنیا میں ملت اسلامیہ کا وجود قائم ہے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر وقیمت متعین کریں خواہ وہ اعمال مادی اغراض ومقاصد کے حصول کی خاطر ہی کیوں نہ ہوں اس مادیت کے کثیف مقاصد سے روحانیت کی لطیف منازل کی طرف گام زن ہو جئے ۔ مادہ کثرت کا مظہر ہے اور روح نورانیت ۔ زندگی اور وحدانیت کی قندیل ۔ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ ان کی تاریخ کے نازک ترین ادوار میں مذہب (اسلام) نے ملت کو بچایا ہے نہ کہ ملت نے مذہب کو (یعنی اگر اسلام کی حفاظت کی طرف توجہات مرکوز کروگے تو تم خود بخود محفوظ ہو جاؤ گے اور اگر یہ سمجھو گے کہ مسلم افراد کی حفاظت ہو جائے تو اسلام بھی محفوظ ہو جائے گا تو یہ خام خیالی ہے) ۔ اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو صرف اسلام کے نقطہ ماسکہ پر مرتکز کر دیں ۔ اور جو زندہ اور پائندہ قائم ودائم نظریۂ حیات وہ پیش کرتا ہے اس سے اپنی بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کرلیں گے ۔ اور یوں اپنے آپ کو تباہی وبربادی کے مہیب جہنم سے بچالیں گے ۔ قرآن کریم کی ایک ہتم بالشان آیت[1] میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ ایک فرد واحد کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کے مثل ہوتی ہے ۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات جو بہ حیثیت قوم نوع انسانی کے متعلق اس بلند ترین تصور کے اولین مظہر ہونے کے جائز مدعی ہو سکتے ہیں باہمی بے تعلقی کو چھوڑ کر ایک جسد واحد کی طرح ایسی زندگی بسر کریں (کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ کے آب گینہ میں آنسو چھلک آئے) جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں معاملات جس طرح بہ ظاہر نظر آتے ہیں ۔ ان کی حقیقت اس سے کہیں مختلف ہے تو اس سے میں آپ کو کسی چیستان میں الجھانا نہیں چاہتا ۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم آپ کے افق دماغ پر اس وقت

---

[1] مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۔ الآیۃ

نور افشاں ہوگا جس وقت آپ انہیں حقیقی "اجتماعی خودی" کی روشنی میں دیکھنے کا ملکہ حاصل کرلیں گے قرآن کریم کے الفاظ میں

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ

(اپنی خودی کا استحکام کرو اگر تم خود صحیح راستہ پر گام زن ہو گے تو کوئی غلط راستہ پر چلنے والا تمہیں نقصان نہیں پہونچا سکے گا۔)

(یہ ہے وہ خطبہ جسکے متعلق ہم نے لمعات میں لکھا ہے کہ اس وقت جب کہ فکر و نظر کی پریشانیوں کی وجہ سے مسلمانان ہند کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں ہے۔ حضرت علامہؒ کے یہ ارشادات گرامی روشنی کے بلند مینار کی طرح ساحل مقصود کی طرف صحیح راہنمائی کر رہے ہیں۔ یہ خطبہ ایسا نہیں ہے کہ آپ اسے ایک مضمون کی طرح سرسری نگاہ سے پڑھ ڈالیں اور پھر اُٹھا کر رکھ چھوڑیں۔ بلکہ اس کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے، اور جب تک ایک بات کا صحیح مفہوم واضح طور پر ذہن نشین نہ ہو جائے آگے نہ بڑھا جائے جب اس طرح یہ گران قدر خیالات آپ کے خاطر نشین ہو جائیں گے تو اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اقبال کا صحیح مقام کیا تھا۔ اور پھر آپ سمجھ سکیں گے کہ حضرت علامہؒ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ ؎

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

طلوعِ اسلام)

حیات آفریں شہادت

(اسدؔ ملتانی)

اہلِ دل قربانیِ شبیرؑ کا غم کیوں کریں ؟
زندۂ جاوید ہو جانے کا ماتم کیوں کریں

دے کر اس مردانہ قربانی کو مظلومی کا رنگ
ہم شہیدِ کربلا کی شان کو کم کیوں کریں !

سر کٹایا کس سکون و صبر سے شبیرؑ نے
رو کے اس جمعیتِ خاطر کو برہم کیوں کریں

زندگی کا جزو ہونی چاہیے یادِ حسینؑ
ہم اسے محدودِ ایامِ محرم کیوں کریں

جب ظفر مندی شہیدوں ہی کے حصے میں رہی
دل کو پُرغم کیوں کریں آنکھوں کو پُرنم کیوں کریں

ہم مناقب ہی سنائیں گے مصائب کے بجائے
داستانِ فتح کو افسانۂ غم کیوں کریں

آنسوؤں سے اوس پڑ جاتی ہے دل کے جوش پر
زخمِ درد انگیز کو مرہونِ مرہم کیوں کریں

سرفروشی اور جانبازی کا میداں چھوڑ کر
گریہ و زاری کے گوشے کیطرف رم کیوں کریں

زندگی کا درس دیتا ہے ہمیں خونِ حسینؑ
موت کا سامان رو رو کر فراہم کیوں کریں

گلبنِ باغِ شہادت جنکو بننا چاہیے
وہ جوانانِ چمن تقلیدِ شبنم کیوں کریں

آؤ اس سے دورِ گیتی کا بدل ڈالیں نظام
جذبۂ ذوقِ عمل کو نذرِ ماتم کیوں کریں

اسوۂ شبیرؑ اپنے سامنے ہے اے اسدؔ
پیشِ باطل گردنِ تسلیم کو خم کیوں کریں

عرضداشت بخدمت

حضرات علماء کرام و بزرگان عظام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ۔ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اما بعد ؛ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؛ قال اللّٰہ تعالیٰ ؛ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ ؛

اور کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (اے مسلمانو) اگر تم نے بھی ایسا ہی نہ کیا (یعنی ایک دوسرے کے دوست نہ ہوئے) تو (یاد رکھو) یہ (تمہارے لئے) زمین میں بڑے فتنہ و فساد کا موجب ہوگا

ہندوستان کے مسلمان جس نازک دور سے آج کل گذر رہے ہیں وہ کسی دیکھنے والی آنکھ اور حرکت کرنے والے قلب سے پوشیدہ نہیں۔ اِس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں جبکہ پرانے دستورِ حکومت کی بساط سمٹ رہی ہے اور اس کی جگہ ایک جدید نظامِ حکومت کا نظر فریب دام ہمرنگِ زمین آہستہ آہستہ۔ غیر محسوس طور پر بچھایا جا رہا ہے جیسے رات کی تاریک چادر ہر شے کو نہایت خاموشی سے دبے پاؤں ڈھانپ لیتی ہے۔ ہر وہ صاحب بصیرت مسلمان جس کی انگلیاں نبضِ ملت پر اور نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہیں۔ محسوس کر رہا ہے اور بہ شدت محسوس کر رہا ہے کہ اگر عوام مسلمان اپنے مستقبل سے اسی طرح بے خبر اور خواص اپنے مناقشات میں بایں نقطہ منہمک رہے تو وہ دن دور نہیں جب یہاں ۹ کروڑ فرزندانِ توحید کو دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

وَاِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۵۱/۲۳ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو اس مہلت سے فائدہ اٹھائیں اور پیشتر اس کے کہ وہ آنے والا خطرہ سر پر آپہنچے۔ اس کے روک تھام کی تجویز کرلیں۔ اور قبل اس کے کہ دامنِ سحاب میں تڑپنے والی بجلیاں بے نقاب ہوکر اپنی شعلہ فشانی کا تماشا دکھائیں وہ اپنے خرمنِ ایمان و متاعِ دین کی مناسب تدابیر سے حفاظت کرلیں۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (۸/۶۰) کے ارشاد خداوندی کے مطابق پورے ساز و سامان کے ساتھ ان خطرات کے مقابلہ کے لئے چاق و چوبند رہیں

ایسے نازک دور اور پرخطر حالات میں آپ حضرات کا یہ اجتماع اربابِ نظر کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اہم ترین مسائل جو آج ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ملتِ اسلامیہ کے لئے موت و حیات کی کشمکش کا موجب بن رہے ہیں۔ آپ حضرات کی نگاہوں کے سامنے ہوں گے۔ اور آپ ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں پورے غور و فکر سے کام لیں گے۔ لیکن طلوعِ اسلام جس کا مقصدِ وحید مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ سے متعلق امور کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ موقعہ کی نزاکت کے اعتبار سے چند گزارشات آپ حضرات کی خدمتِ گرامی میں پیش کرنے کی جرأت کرے۔ امید ہے کہ اس جذبہ کے پیشِ نظر جس نے حضرت عمرؓ کو مدینہ کی ایک بڑھیا کے ٹوکنے پر اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنے کی دعوت دی تھی۔ آپ حضرات ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ کیونکہ حکمت مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے۔ جہاں کہیں ملے لے لینی چاہیئے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

متحدہ قومیت

ہندوستان کی موجودہ تحریکِ آزادی کی بنیادیں اس نظریہ پر قائم ہیں کہ اس ملک کی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے تمام انسان

---

۵۱ یہ ایسا ہی یقینی ہے جیسے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو۔

۵۲ ان (کفار) کے مقابلہ کے لئے پوری قوت سے تیار رہو۔

ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور کانگریس اس قوم کی نمایندہ جماعت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا متحدہ قومیت کا یہ تصور اور معیار اسلامی ہو سکتا ہے؟ اس بحث میں الجھنا مفید مطلب نہ ہوگا۔ کہ کتب لغت میں قوم کے کیا معنی ہیں۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ متحدہ قومیت کا جو مفہوم سیاست حاضرہ میں لیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے اس قسم کی متحدہ قومیت کا تصور اسلامی ہو سکتا ہے یا نہیں!

یہ تو ظاہر ہے کہ قومیت نام ہے ان امتیازی خطوط کا جن سے انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ سے متمیز ہوتا ہے۔ اور متحدہ قومیت کے نظریہ کے ماتحت یہ امتیازی خطوط وہ جغرافیائی حدود ہیں جو اس ملک کو محیط ہیں۔ اس جغرافیائی نظریہ کے غیر اسلامی ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جغرافیائی حدود تو محض اتفاقی حادثات ہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ خود فطرت کے نظام عمل کے ماتحت یہ حدود بدلتی رہتی ہیں۔ اور پھر انسانی قوانین بھی آئے دن ان حدود و قیود میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہتے ہیں[1]۔ لہٰذا وہ قرآن کریم جو شرق و غرب کے امتیازات سے بلند و بالا ہے۔ اور وہ خدائے بزرگ و برتر جو مشارق و مغارب کا مالک ہے۔ کیا ایسی کمزور چیزوں کو انسانی تقسیم کا معیار قرار دے سکتا ہے! قرآن کریم کی رو سے انسانوں کی تقسیم کا معیار ہے کفر و ایمان۔ اس کے نزدیک تمام روئے زمین پر بسنے والے مؤمن ایک قوم ہیں اور غیر مسلم ایک الگ قوم۔ غیر مسلموں کے پاس چونکہ کوئی ایسا ضابطۂ خداوندی نہیں جو ان امور میں ان کی راہ نمائی کر سکے اس لئے وہ اپنے ذہن سے نت نئے بودے معیار قائم کرتے رہتے ہیں کبھی وہ قوموں کی تقسیم نسل کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ کبھی زبان کی رو سے۔ کبھی رنگ کے معیار پر کبھی وطن کے۔

اسلام انسان کو ان غیر فطری حدود و ثغور سے بلند لے جاتا ہے اور ان کی تقسیم مادی امتیازات کے بجائے قلبی امتیاز کے ماتحت کرتا ہے۔ اس قلبی امتیاز کا نام ہی کفر و اسلام

[1] کل تک برما ہندوستان کا ایک جزو تھا۔ اور آج ایک الگ ملک ہے۔ منہ

کی تفریق اِن مختلف امتیازات کی وجہ سے مختلف کلچر جس کا ترجمہ عام طور پر تہذیب یا تمدن کیا جاتا ہے پیدا ہوتے ہیں وہ مخصوص ذہنیت جو اسلام کی روح کو اپنے اوپر طاری کر لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی کلچر ہے۔ اور یہی کلچر وہ رشتہ ہے جس میں منسلک ہو کر تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم بن جاتے ہیں اور مسلمانوں کی قوم تمام دنیا کی قوموں سے متمیز ہو جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلامی معیار تقسیم کی رو سے ہندوستان کے مسلمان اور ہندو دونوں ملکر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اکثریت کا چونکہ اس میں فائدہ ہے کہ وہ قومیت کی ایسی تعریف کرے جس سے اقلیتیں الگ قوم نہ بن سکیں بلکہ اکثریت کے اجزا بنی رہیں اسلیئے ہندوؤں نے یہاں بہ تقلید یورپ۔ قومیت کا معیار "وطینت" قرار دے دیا ہے حالانکہ خود یورپ اب اِس معیار تقسیم کو اپنے ہاتھوں سے توڑ رہا ہے۔ جرمنی کے اندر بسنے والے یہودی اس ملک سے نکالے جا رہے ہیں۔ اور سوئٹزرلینڈ کے رہنے والے جرمن۔ جرمنی کے باشندوں کے ہم قوم قرار پا چکے ہیں۔ کلچر کے معیار کے مطابق اہلِ ہند کی تقسیم چونکہ ہندوؤں کے مفاد کے خلاف ہے اِس لئے وہ اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔ چنانچہ ان کے نوجوانوں کے نمائندے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کو انکار ہے کہ مسلمانوں کا کوئی الگ کلچر ہے۔ اور ان کے قدامت پسند طبقہ کے نمائندے۔ مہاتما گاندھی کی تجویز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب (کلچر) کو ملا کر ایک کر دیا جائے۔ تاکہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور ہی باقی نہ رہے ان تمام امور کو اس مضمون میں واضح طور پر بیان کیا جا چکا ہے جو "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد" صاحب کے عنوان سے طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اِس مضمون کا بغور مطالعہ فرمائیں اور پھر واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان فرمائیں کہ مسلم قومیت کا معیار وطینت ہے یا ان کے لئے وجہ جامعیت ایمان ہے یہ چیز آپ ہی نے ہمیں بتائی تھی کہ لیس البران یحب الوطن ولکن البران یحب العالم

ترجمہ۔ نیکی اس میں نہیں ہے کہ وطن سے محبت کیجائے۔ بلکہ نیکی اس میں ہے کہ ساری دنیا سے محبت کی جائے۔ اسلام اسی عالم پرستی کی دعوت لے کر آیا۔ وہ اپنے پیروؤں کو وطن پرست نہیں بلکہ انسانیت پرست دیکھنا چاہتا ہے۔

(مولانا آزاد۔ در ۱۹۲۰ء بحوالہ "مسلمانوں کا ایثار" ص ۳۰۹)

اگر یہ صحیح ہے کہ مسلم قومیت کی بنا، وطنیت نہیں۔ اور مسلم اور غیر مسلم ملکر ایک قوم کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ تو ہندوستان میں متحدہ قومیت کا مسلک کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے! جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ نظریہ یورپ کے مادہ پرستوں کی اختراع ہے جسے ہندو اپنے قومی مفاد کی خاطر یہاں رائج کر رہا ہے لیکن مسلمان بنا بر اتباع و تقلید کوئی مسلک اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے سامنے اس خطبۂ صدارت کے چند الفاظ پیش کئے جائیں جو آپ کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۱ء میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ارشاد فرماتے تھے یہ الفاظ شاید آج بعض حضرات کو غیر مانوس معلوم ہوں۔ لیکن آپ میں سے اکثر حضرات ان سے ناآشنا نہ ہوں گے۔ آپ کے صدر نے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

حضرات علمائے کرام و ارکان جمعیتہ! اس وقت ایک بڑی آزمائش ہمارے طریق عمل کے لئے درپیش ہے۔ ہم نے مدتوں کی غفلت کے بعد قومی و اجتماعی اعمال کی کشمکش و کشاکش میں قدم رکھا ہے اس لئے سب سے پہلے ہماری نظر آج کل کے مجلسی اور اجتماعی کاموں کے طرق و اسلوب پر پڑتی ہے اور تقلید و محاکات کا جذبہ ہمیں بے اختیار ان کی جانب کھینچنے لگتا ہے لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی راہ ان راہوں سے بالکل الگ ہے۔ اور کتاب اللہ کی ہدایت اور حکمت نبوی کی سنت نے آپ کو دنیا اور دنیا والوں کے تمام گھڑے ہوئے طریقوں اور قاعدوں سے مستغنی کر دیا ہے آپ اس لئے نہیں آئے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں کی تقلید کریں بلکہ آپ کو علم و عمل شریعت اس لئے دیا گیا ہے تاکہ دنیا کی آنکھیں آپ کی طرف امید و طلب سے اٹھیں اور آپ کی ہدایت ان کے لئے اتباع و تقلید کا پیام ہو

آپ کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اس کے رسول صلعم کی سنت ہے۔ اور ان دو چیزوں سے بڑھ کر اور کونسا مبداء علم اور سرچشمۂ حکمت ہو سکتا ہے جو انسانی اعمال کے تمام اصول و فروغ کے لئے دنیا میں وجود رکھتا ہو۔ دنیا میں علم و یقین صرف وحی الٰہی اور علوم و اعمال نبوت میں اس کے سوا علم و یقین اس سارے دنیا کے نیچے موجود نہیں"

حضرات! سیاستِ حاضرہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم و غیر مسلم کے امتزاج سے ایک "متحدہ قومیت" کا تصور کس طرح اسلامی تعلیم کے مطابق ہو سکتا ہے ہمیں امید ہے کہ آپ اس سوال کے مختلف گوشوں پر کتاب و سنت کی روشنی میں غور فرما کر ایک واضح نتیجہ کا اعلان فرمائیں گے۔

مذہب کا تحفظ

حضرات! مسلمانوں سے آج یہ کہا جاتا ہے کہ جب کانگریس اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ ان کے مذہب کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا تو پھر ان کے لئے عدم اعتماد کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی!

یہ دلیل بظاہر بڑی خوش آئند معلوم ہوتی ہے لیکن جب ذرا گہری نگاہ سے اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔ تو اس ضمانت کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اربابِ کانگریس جن میں مسلم قومیت پرست حضرات پیش پیش ہوتے ہیں اس امر کا کھلم کھلا پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ مذہب صرف پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ یہ چیز آپ ابھی ابھی اپنے ایک سابقہ صدر کی زبانی سن چکے ہیں کہ مذہب اسلام پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ مولانا آزاد ہی نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بستر مرگ پر یٰسین کو دہرا دینے کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے" (الہلال ۹ ۱/۱۲)

اسلام محض اخلاقی ضابطہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی کا نام ہے۔ مسلمانوں کے جملہ

امورِ حیات۔ معاشی ہوں یا معاشرتی ، سیاسی ہوں یا "مذہبی"۔ تمدنی ہوں یا عمرانی تمام کے تمام ایک قانونِ الٰہی ایک ضابطۂ خداوندی کے ماتحت سرانجام پاتے ہیں۔ اور اس نظامِ زندگی کا نام ہے اسلام۔ ایسے مذہب کو منظم مذہب (ORGANISED RELIGION) کہتے ہیں اور منظم مذہب کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو علانیہ فرماتے ہیں کہ ایسے مذہب کے وجود سے اِن کا دل کڑھتا ہے۔ اور اِن کی دیرینہ آرزو ہے کہ ایسا مذہب (نعوذ باللہ) صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو "میری کہانی" صفحہ ۱۴۱)

کیا آپ حضرات کے نزدیک بھی مذہب محض ایک پرائیویٹ عقیدہ کا ہی نام ہے! اور کیا مذہب کے تحفظ کے متعلق کانگریس کی کوئی ضمانت کافی ہو سکتی ہے! یہ مذہب کو پرائیویٹ حیثیت دیدینے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ایسی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک آنے لگی ہیں کہ "مہاتما گاندھی تمہارے مذہبی امام تو نہیں ہو سکتے لیکن سیاسی امام ضرور ہو سکتے ہیں"۔ کیا آپ حضرات اِس نظریہ کی تائید کرتے ہیں! اور مذہب اور سیاست کی اِس تفریق کو اسلام کے مطابق خیال فرماتے ہیں!

منظم مذہب کے تحفظ کی ضمانت کو چھوڑیئے! قرائن بتا رہے ہیں کہ عام شعائرِ اسلامی کے ادا کرنے میں جیسی کچھ انفرادی آزادی آج حاصل ہے آنے والی حکومت کے دور میں وہ بھی باقی نہیں رہے گی۔ مثلاً ذبیحہ گاؤ کو لیجئے اگرچہ یہ چیز مذہبی فریضہ نہیں۔ صرف مذہبی رخصت ہے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ اگر کوئی طاقت مسلمانوں کے کسی مذہبی حق کو زبردستی چھیننا چاہے تو اس حق کی حفاظت فرض ہو جاتی ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ اس باب میں ہندوؤں کے کیا خیالات ہیں۔ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں۔

> یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یوروپین کے لئے گاؤکشی جاری رہنے کے بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے

طول و عرض میں ایسا نہیں ہے جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ اور ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں۔ یہ اس کی روح کے سراسر خلاف ہے وہ عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤکشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے اغماض نہیں کرے گا"

(الفضل ۹ مارچ ۱۹۱۸ء بحوالہ اسٹیٹسمین)

پھر انہیں مہاتما جی نے ہری پور کانگریس کے اجلاس کے موقعہ پر بالکل واضح الفاظ میں فرمادیا کہ "کسی نہ کسی طرح بذریعہ قانون گئوکشی بند کی جائے گی"

(مسلمانوں کا ایثار صفحہ ۳۷۰)

ذرا آگے بڑھیئے! ہندوستان کی آئندہ نسلوں کے لئے جو تعلیمی اسکیم تیار کی گئی ہے، اور جو لازمی اور جبری تعلیم ہوگی۔ اس میں ہے کہ تمام مذاہب اصولی سچائیوں کے لحاظ سے بالکل یکساں ہیں۔ اور فلسفۂ حیات کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اہمسا کو ہمسا پر فضیلت حاصل ہے ان امور کے تشریح کے لئے نصاب تعلیم میں اکبر اور دارا شکوہ کے سوانح حیات اور مہاتما گاندھی اور مہاتما بدھ کے کوائف زندگی شامل کئے گئے ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ جن بچوں کو جبری طور پر اس قسم کی تعلیم دی جائے گی کیا ان کے دل و دماغ کبھی صحیح اسلامی قالب میں ڈھل سکیں گے؟ یہ تو خیر آنے والے زمانہ کی باتیں ہیں۔ آج کانگریس میں سوشلسٹ نوجوانوں کی اکثریت ہے۔ اور مسٹر بوس کے انتخاب نے بتادیا ہے کہ یہی گروہ آئندہ کانگریس کا روح رواں ہوگا۔ سوشلزم کے متعلق آپ حضرات کو علم ہوگا کہ یہ نظام کس درجہ دہریت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ہندوستان میں آج سوشلزم کا سب سے بڑا مدعی جواہر لال نہرو ہے۔ جو دہریہ ہے۔ اسے خدا کے نام سے اس درجہ چڑ ہے کہ ڈاکٹر عالم کے مقدمہ میں اس نے عدالت سے کہدیا کہ وہ خدا کے نام کی قسم کھانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ ان حالات کے ماتحت مسلمان کس طرح اپنے آپ کو فریب دے سکے کہ متحدہ قومیت کے نظام حکومت کے ماتحت ان کے مذہب کا تحفظ کیا جائے گا۔

آپ غور فرمائیں کہ کیا وہ مسلک جو ملک میں اس قسم کے نظام حکومت کے قیام کی دعوت دے رہا ہو۔ کبھی اسلامی مسلک کہا جا سکتا ہے! یہ ظاہر ہے کہ آنے والا نظام حکومت جمہوری نظام ہوگا۔ یعنی اس نظام میں اکثریت کے فیصلے ملک کا قانون بنا کریں گے اور اکثریت لامحالہ ہندوؤں کی ہوگی۔ ہندوؤں کی حکومت کے متعلق آپ کی جمعیت کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب کی رائے ہے کہ۔

”اسلامی حکومت کے زوال پر اگر خدانخواستہ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا۔ جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے۔ حکمران بنکر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی“

(الجمعیۃ۔ بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء صفحہ ۲)

کہیں آج مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ کانگریس یعنی ہندوؤں کی اکثریت پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔ کامل اعتماد کرو۔ موہومہ خطرات کو دل میں نہ آنے دو۔ کانگریس کو حکومت دلانے میں اپنی پوری کوشش کرو۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کی محافظ ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

”جواہر لال ہندو ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں اس کے باوجود وہ مسلمانوں کا تحفظ چاہتا ہے“

(زمزم لاہور۔ بابت ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا۔ غیر مسلم تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ۔ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ۔ وہ چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ کی اس شمع نورانی (اسلام) کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ جب صورت حالات یہ ہو تو فرمائیے کہ کفار کے ساتھ نوٹی۔ دلی دوستی۔ قلبی اعتماد کے تعلقات کس طرح پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشادات گرامی آپ

حضرات کے سامنے ہیں۔ وہ کتنی شدت اور تکرار سے مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ کفار کے ساتھ بھروسہ اور رازداری کے دلی تعلقات بھی قائم نہ کرو اور جب ان سے دلی تعلقات قائم نہیں کئے جا سکتے تو حیرت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی متحدہ قومیت کیسے بن سکتی ہے! اور جب متحدہ قومیت نہیں بن سکتی تو پھر سوائے اس کے اور کونسا مسلک صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمان پہلے اپنا الگ قوم ہونا تسلیم کرائیں پھر ایک باوقار معاہدہ کی رو سے ہندوؤں سے اشتراکِ عمل کریں۔ آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ آپ کی جمعیۃ کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب نے جمعیۃ کے اجلاس مراد آباد کے قریب ایک مبسوط بیان میں فرمایا تھا کہ۔

جب کانگریس حکومتِ ہند سے اپنے مطالبات منظور کرا رہی ہے تو مسلمان اگر کانگریس سے اسی بنا پر مفاہمت کرنا چاہیں تو کیا بیجا ہے؟

(مسلمانوں کا ایثار، صفحہ ۴۲۵)

یہی آج مسلمانوں کے جمہور کا مطالبہ ہے اور ان کی درخواست ہے کہ اس مطالبہ میں آپ نہ صرف ان کے ہمنوا ہوں بلکہ ان کی قیادت کریں۔ جیسا کہ آپ کے جلیل منصب کا تقاضا ہے۔

(۴)

حصولِ آزادی

کہا جاتا ہے کہ حصولِ آزادی مقدم ہے۔ دوسری چیزوں پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تو آئینی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ یعنی انگریز کی حکومت کی جگہ نیا نظامِ حکومت رفتہ رفتہ ملک میں نافذ کیا جا رہا ہے۔ اگر آزادی سے مفہوم انگریز کا یہاں سے نکل جانا ہے تو ظاہر ہے کہ جس دن انگریز یہاں سے نکلا اسی دن موجودہ نظام کی جگہ نیا نظامِ حکومت یہاں مسلط ہو چکا ہوگا اور "دوسری چیزوں" پر غور کرنے کی گنجائش بالکل نہ ہوگی سوال یہ ہے کہ کیا یہ دوسرا نظامِ حکومت جو تدریجاً ملک پر مسلط ہو رہا ہے ایسا نظام ہے جس میں مسلمان اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی

امور میں حکومتِ الٰہی کے منشار کے مطابق زندگی بسر کر سکے گا! اور جس کے لئے اسے کانگریس میں مدغم ہو کر اندھا دھند کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ کہ ہندوؤں کا مقصد انگریز کو یہاں سے نکال دینا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کانگریس کا نصب العین "پورنا سوراجیہ" ہے۔ لیکن

یہ ہے وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

آج تک متعین ہی نہ ہو سکا کہ اِن الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مہاتما گاندھی سے جو اس ترکیب کے مصنف ہیں۔ بار بار اس کا مفہوم دریافت کیا گیا ہے لیکن انہوں نے جو بتایا وہ بجائے خویش ایک چیستاں ہے۔ ۲ر مارچ ۱۹۳۰ء کو سابرمتی سے جو خط انہوں نے حکومت ہند کے نام لکھا تھا اس میں ہے کہ حکومت کو "سوراجیہ" سے خائف نہیں ہونا چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

"اگر ڈومینین اسٹیٹس جس کا آپ نے اعلان کیا ہے۔ اصل معنوں میں استعمال کیا جائے تو سوراج کے ریزولیشن سے کوئی خطرہ محسوس کرنا نہیں چاہیئے۔ اس لئے کہ برطانوی مدبرین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ڈومینین اسٹیٹس بھی ایک قسم کی آزادی ہے۔ لیکن مجھے جو اندیشہ ہے وہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں ڈومینین اسٹیٹس دینے کا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے"۔

۶ر مارچ ۱۹۳۱ء کو امریکہ کے اخبارات کے نمائندوں کے استفسار کے جواب میں گاندھی جی نے "پورنا سوراجیہ" کے متعلق فرمایا۔

"سوراج کے معنی ہیں اندرونی طور سے منظم حکومت اور پورنا کے معنی ہیں مکمل۔ کوئی صحیح لفظ نہ پاتے ہوئے ہم نے "مکمل آزادی" کے لفظ کو اس کے معنوں میں مجبوراً اختیار کر لیا ہے۔ پوسن سوراجیہ کا مطلب یہ نہیں کہ کسی بیرونی طاقت سے تعلقات نہ رکھے جائیں۔ پھر برطانیہ سے یہ تعلقات کیسے منقطع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ تعلقات تو باہمی فائدے کے لئے ہیں"۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ "پورن سوراجیہ" برٹش جھنڈے کے نیچے قبول کریں گے۔

انہوں نے کہا۔

"اس جھنڈے کے نیچے نہیں۔ بلکہ اگر ممکن ہوا تو ایک مشترک جھنڈے کے نیچے۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو علیحدہ قومی جھنڈے کے نیچے"

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ گورنروں اور کانگریسی وزراء میں تصادم کے موقع پر مہاتما جی نے کہا تھا کہ

"برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لئے میں اپنے خون کا آخری قطرہ صرف کردوں گا"

برطانیہ کے ساتھ تعلقات کے متعلق ۱۹۳۸ء کی کانگریس کے سالانہ اجلاس کی تقریب پر صدر کانگریس نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا۔

"سلطنت برطانیہ اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک راستہ پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اس انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے۔ یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا۔ برطانیہ عظمیٰ کے لئے اپنے نظامِ سلطنت کے اندرونی تضاد و تبائن کو ختم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ سلطنت کو آزاد قوموں کے وفاق میں تبدیل کردے"

اور پھر جب آپ اس بیان کو بھی پیشِ نظر رکھیں جو پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی سیاحتِ یورپ کے دوران میں پراگ کے مقام پر دیا تھا اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ۔

انگلستان کا دشمن ہندوستان کا دشمن ہے

تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک موجودہ تحریک آزادی کا منتہیٰ کیا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک آزادی سے مفہوم محض "معاشی آزادی" ہے۔ کیا قرآن کریم کی رو سے مسلمان کے لئے بھی آزادی کا مفہوم صرف اسی قدر ہے! پھر جب حالت یہ ہے تو غور فرمایئے کہ یہ ایسا کونسا عظیم الشان مقصد ہے جس کے لئے مسلمان اپنی جداگانہ ہستی۔ اپنی الگ قومیت۔ اپنی خالص اسلامی اجتماعیت۔ اپنی مرکزیت گم کرکے مسلم و غیر مسلم کے امتزاج سے ایک "متحدہ قومیت"

کی تشکیل کو جہادِ عظیم سمجھ لے۔ مسلمان کے نزدیک صحیح آزادی صرف وہ آزادی ہے جس میں وہ اِس کرۂ ارض پر حکومتِ الٰہی قائم کر سکے۔

اگر باین نرسیدی، تمام بولہبی است

نظامِ اجتماعی

حضرات! ہم سے زیادہ آپ واقف ہیں کہ اسلامی زندگی اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ اسلام کے نزدیک جس طرح مسلم و غیر مسلم کی مخلوط جماعت کی کوئی اصل نہیں۔ اِسی طرح اِس کی رو سے انفرادی زندگی کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

اسلام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی بلا شرکتِ غیرے اپنی جماعت ہو۔ اپنا امیر ہو۔ اپنا نظام ہو۔ اور اِس طرح یہ خود بھی ضابطۂ الٰہی کے ماتحت زندگی بسر کریں اور پھر ساری دنیا کو اِس حکومتِ الٰہی میں شامل کرنے کی کوشش کریں۔ امتِ مسلم ابھی تک وہ زمانہ نہیں بھولی جب آپ حضرات ہر منبر، ہر اسٹیج اور ہر پلیٹ فارم سے مسلمانوں کو یہی پیغامِ ہدایت دیا کرتے تھے کہ جماعت اور امیر کے بغیر کوئی زندگی اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالہ "مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" میں سے ذیل کے اقتباسات ہم تمثیلاً پیش کرتے ہیں۔

"اِسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام "جماعت" رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو "جاہلیت" اور حیاتِ جاہلی سے تعبیر کیا ہے۔"

قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شئے نہیں ہے، ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے اور فرد کا وجود اور اعمال بھی اس لیئے ہیں تاکہ ان کے اجتماع و تالیف سے ہیئتِ اجتماعیہ پیدا ہو"

پس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا۔ اور اسلام کا دوسرا نام جماعت۔ اور التزامِ جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کیگئی اور اعلان کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور اطاعتِ امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اسکی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپکو مسلمان سمجھتا ہو"

مسلمانوں کے لیئے راہِ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کیطرح اب بھی ایک ہی ہے۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس معصیت سے باز آجائیں۔ جس میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے اُنپر بند ہو گئے ہیں۔ جماعتی زندگی کی معصیت سے مقصد یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت "بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے، وہ بالکل اس گلے کی طرح ہیں جسکا انبوہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو ..... قرآن و سنت نے بتایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے، اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے"

پس اے اربابِ علم و بصیرت و صاحبانِ عقل و فراست فرمایئے! کہ وہ جماعت، وہ امیر، وہ اسلامی نظام۔ وہ مرکزیت آج کہاں ہے! کیا جماعت سے مراد وہ کانگرس ہے۔ جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے کیا امیر سے مفہوم کانگرس کا صدر ہے جو کبھی بُت پرست اور کبھی دہریہ ہوتا ہے! اغور فرمایئے کہ سب سے مقدم یہ چیز نہیں کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کا سبق دے کر انہیں ایک مرکز پر جمع کیا جائے! ہم نے

مانا کہ احوال وظروف بدل جایا کرتے ہیں۔ لیکن کیا خدا ورسولؐ کے احکام بھی ایسے ہیں، کہ احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ وہ بھی بدل جائیں۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہی زندگی جو خود آپ حضرات کے تفقہ فی الدین کے مطابق کفر و جاہلیت کی زندگی ہے۔ کسی وقت عین اسلامی زندگی قرار پاجائے اگر یہ صحیح ہے کہ خدا ورسول کے احکام غیر متبدل ہیں تو پھر کیا مسلمانوں کی جداگانہ جماعت و مرکز کا قیام سب سے مقدم اور عین تقاضائے اسلام نہیں!

حضرات! یہ تو ابھی معلوم نہیں کہ اس مرتبہ آپ کے محترم صدر کا خطبۂ صدارت کیا ہوگا۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے خطبۂ صدارت میں آپ صاحبان کو یوں مخاطب کیا گیا تھا:۔

حضرات! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کروں جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل واساس کے یقین کرتا ہوں۔ اور کامل بارہ برس کے مستقل غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہونچا ہوں کہ بغیر اسکے کبھی عقدہ کا حل نہیں ہوسکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام جماعت اور قیام امارت شرعیہ کیجانب ہے، مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کرکے حیات اجتماعی وشرعی اختیار نہ کرلیں۔ یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہوجائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے، یہی اصل واساس کار ہے۔ اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا ظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے، حضرات اسلام کے نظام اجتماعی کی نسبت کسی شرح وتفصیل کی ضرورت نہیں۔ علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیق الٰہی سے اسوقت میرے گرد وپیش موجود ہے، اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے، کہ کسی حال میں بھی

فرادیٰ متفرق الگ الگ اور منتشت نہ ہوں، ہمیشہ مجتمع مؤتلف۔ متحد۔ اور کنفس واحدہ ہوکر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا۔ اور کفر و شرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اسقدر اصرار اور تاکید کے ساتھ نہیں روکا، عقیدۂ توحید سے لیکر تمام عبادات واعمال تک یہی حقیقتِ مرکزیہ جلوہ طرازی کررہی ہے اور اسی بنا پر بار بار نظمِ جماعت پر زور دیا گیا ہے۔ علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ ..... "..... (خطبۂ صدارت مولانا آزاد۔ اجلاس جمعیۃ العلماء لاہور)

اسی خطبہ میں موجودہ حالت کے متعلق فرمایا تھا:۔

"اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرۂ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کررہی ہے کہ نہ تو کوئی ان میں رشتۂ انسلاک ہے نہ وحدتِ ملّت کا کوئی رابطہ ہے نہ کوئی قائد وامیر ہے اور نہ کوئی آمر و ناقد شرع ہے محض ایک بھیڑ ہے۔ ایک انبوہ ہے ..... ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیاتِ غیر شرعی وجاہلی ہے، جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔"

اسکے بعد خطبۂ مذکور میں یہ بحث کیگئی تھی کہ جب کوئی قوم کفار کے غلبہ سے محکوم ہوجائے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے، اور اس باب میں فتنۂ تاتار اور فتاویٰ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے تذکرہ کے بعد ارشاد تھا کہ

"فی الحقیقت احکام شرع کی رُو سے مسلمانانِ ہند کے لیئے دو راہیں تھیں اور اب بھی دو راہیں ہیں۔ یا تو ہجرت کرجائیں یا نظامِ جماعت قایم کرکے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔"

چونکہ یہ راہِ عمل کتاب وسنت کی روشنی میں متعین کی گئی تھی۔ اسلیئے جس طرح یہ ۱۹۲۱ء میں عین راہِ صواب تھی۔ اسی طرح آج ۱۹۳۹ء میں بھی اسے صراطِ مستقیم ہونا چاہیئے، اُمّت کی آپ سے درخواست ہے کہ آپ اِس راہِ رُشد وہدایت میں ان کی راہ نمائی فرمائیں۔

اپنے اور بیگانے | حضرات! یہ شکایت کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کے مدعی جذبۂ حریت سے خالی ہیں۔ ٹوڈی ہیں۔ سرکار پرست ہیں، اوّل تو یہ الفاظ ہر شخص کے متعلق استعمال نہیں کیے جاسکتے لیکن اگر بفرضِ محال اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو غور طلب بات یہ ہے کہ اگر کسی مسجد میں ایسے نمازی آتے ہوں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے بلند معیار پر پورے نہیں اُترتے تو کیا اُنکی وجہ سے مسجد کو چھوڑ کر بتکدہ کا رُخ کر لینا جائز ہو جائے گا۔ آپ نے ہی ہمیں بتایا ہے کہ :۔

"اگر ایک بھائی غلطی کر رہا ہے تو تم غلطی مت کرو۔ اور اُسے منالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنوں سے روٹھ کر غیروں کی چوکھٹ پر چلا جائے۔ اور بڑی سے بڑی مصیبت اور بڑے سے بڑا دُکھ برداشت کیا جاسکتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جاسکتا کہ اپنوں کا سر ہو اور غیروں کی چوکھٹ"

(مضامین آزاد حصہ ششم)

آپکا یہ بھی ارشاد تھا کہ مسلمان کے لیئے گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا یا کانگرس میں جاکر شامل ہو جانا۔ دونوں راستے صراطِ مستقیم سے ہٹا دینے والے ہیں

اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اُس کے پیروؤں کو اپنی پولٹیکل پالیسی قایم کرنے کے لیئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے مسلمانوں کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر نیا راستہ پیدا کریں ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں ....

ہم تو خود اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ اُنہوں نے اپنے سامنے دو راستے ہی دیکھے۔ یا گورنمنٹ پر اعتماد! اور یا ہندوؤں اور کانگرس کی شرکت"

(مضامین مولانا آزاد حصہ سوئم)

آپ نے مسلمانوں کو یہ بھی تاکید فرمائی تھی کہ :۔

"نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے۔ اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جیئے" (ایضاً)

فرض کیجئے کہ مسلمانوں کی الگ تنظیم کی حامی جماعت میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو جذبات حریت سے عاری ہیں تو کیا اس اکثریت کو بہت جلد اور آسانی سے اقلیت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا؟ حضرات علماء مسلمانوں کو یہ نصیحت کیا کرتے ہیں کہ کانگریس کی اکثریت سے مت خوف کھاؤ۔ بلکہ جوق در جوق اس میں شامل ہو جاؤ۔ اور یوں اپنے عزم راسخ اور ہمت بلند سے اکثریت پر چھا جاؤ۔ اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کانگریس میں شرکت کے بجائے جسے کبھی خود آپ بھی ضلالت کی راہ بتایا کرتے تھے۔ آپ حضرات جوق در جوق مسلمانوں کے جداگانہ نظام اجتماعی میں شریک ہو جائیں اور اپنے جذبۂ حریت و استقلال سے نہ صرف ان کی اصلاح کریں۔ بلکہ ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دیں۔ یہ اقدام بہر نوع مستحسن ہوگا کیونکہ یہ نظام مسلمانوں کی الگ اجتماعیت اور مرکزیت کا حامی ہے اور اسلامی اصول کی رو سے یہی مسلک صحیح مسلک ہے۔

بزرگانِ محترم! آپ کے جلسہ کے اعلانات سے ظاہر ہے کہ آپ علماء کرام کی جداگانہ جمعیت کو لازمی سمجھتے ہیں اس کے استحکام و استحفاظ کے لئے مشوش اور کوشاں ہیں۔ پھر عام مسلمانوں کی جداگانہ جمعیت کے قیام کو آپ کیوں مسلکِ حریت نوازی کے خلاف قرار دیتے ہیں! کیا مسلمانوں کی عدم موجودگی میں علماء کرام کی جمعیت کا وجود ایسا ہی نہ ہوگا۔ جیسے بغیر گاڑیوں کا انجن جب گاڑیوں کے متعلق فتویٰ یہ ہو کہ غیر انجنوں سے جڑ جائیں تو اپنے انجن کا استحکام اور اس کی حفاظت کے کیا معنی اگر آپ اجازت دیں تو طبیعت پر جبر کر کے ایک تلخ حقیقت کا بھی اظہار کر دیا جائے۔ طنزاً نہیں بلکہ سچے درد اور حمیت کے ساتھ۔ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو خیر امتہ (بہترین قوم) بنا کر بھیجا ہے وہ امتہ وسطیٰ ہیں ان کے ذمہ دنیا کی امامت کا فریضہ ہے شھداء علی الناس ان کا منصب ہے ظاہر ہے کہ جب افرادِ امت کی یہ پوزیشن ہے تو اس امت کے اربابِ علم و فضل کی حیثیت کو دنیا میں کس درجہ ممتاز اور بلند ہونا چاہیئے۔ کیا کانگریس میں ارباب علم و فضل کو یہی رتبہ حاصل ہے؟ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس میں علماء کرام کی حیثیت بالکل مقتدیوں کی سی ہے غور فرمایئے کانگریس کی مجلس عاملہ میں علماء کی کتنی تعداد ہے! اس کے نظام و آئین کی تشکیل و تنسیخ میں علماء کا کتنا حصہ ہے! کانگریس کے مختلف شعبوں میں جو بڑی بڑی سیاسی۔ معاشی۔ معاشرتی۔ اصلاحی اسکیمیں تیار ہوتی رہتی ہیں ان کی تخلیق و تعمیر میں علماء کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک خیرِ اُمت کے ممتاز طبقہ کے صدرِ محترم کو دنیا کے بلند سے بلند مقام پر ہونا چاہئے
اسے ساری دنیا کا امام بننا چاہئے۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرت او برنتابد ہمسرے

کیا اہم سیاسی کانفرنسوں میں آپ کی نمائندگی کو کبھی حق انیاز دیا گیا ہے۔ اگر نہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے علمائے عظام کی حیثیت وہاں امامت و قیادت کی حیثیت نہیں۔ تو پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس بے توجہی سے ملّت اسلامیہ کا سینہ چھلنی کیوں نہ ہو جائے۔ اسی گری ہوئی حیثیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کی جو آواز کانگریس کے پلیٹ فارم سے باہر آتی ہے۔ اس کا اثر ہندو تو ایک طرف خود مسلمانوں پر بھی نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۱ء میں جب خلافت کمیٹیوں کے قیام کی تحریک عام تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کس قدر صحیح فرمایا تھا۔

"کانگریس کمیٹیاں کسی شہر یا بستی میں پچاس جلسے منعقد کر کے مسلمانوں سے کہیں کہ چرخہ چلاؤ اور ولایتی کپڑا چھوڑ دو۔ تو وہ اثر پیدا نہیں ہو گا۔ جو خلافت کمیٹی جمعہ کے دن مسجد میں ایک وعظ کرا کے پیدا کر سکتی ہے" (مضامین مولانا آزاد ۱۹۲۱ء)

ذرا تصور میں لایئے اس حالت کو جب تمام ملتِ اسلامیہ اجتماعی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو آپ جیسے منتخب افرادِ امت پر مشتمل مجلس مشاورت ہو۔ ان میں سے اتقی سب سے زیادہ تقویٰ شعار لہٰذا سب سے زیادہ اکرم ان کا امیر ہو۔ امت کے تمام امور کے فیصلے مرکز سے ہوتے ہوں۔ مرکز کی اطاعت بمنزلہ اطاعتِ خدا و رسول ہو پھر معلوم ہو گا کہ عزت عظمت اور شوکت سب اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہیں غیروں کے ہاں حقیقی عزت اور اصلی عظمت کہاں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو — اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

الحاد کی رَو

حضرات! غالباً آپ نے اس چیز کو بھی محسوس کیا ہو گا کہ آجکل مسلمانوں کے نوجوان طبقہ میں الحاد و بیدینی کی رَو کس برق رفتاری سے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ان میں پیش پیش وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو حریت پسند اور سوشلسٹ کہتا ہے

یہ طبقہ جنگ آزادی کی آڑ میں، خدا، رسول، شریعت، مذہب، ہر چیز کا (نعوذ باللہ) مذاق اڑاتا ہے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان کو (خاکم بدہن) اساطیر الاولین کہتا ہے۔ مذہبی عقائد کی علانیہ تضحیک اور شعائر الٰہی کا بیباکانہ استہزا کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب اور تمدن کی ہنسی اڑائی جاتی ہے مذہب کی پابندی کرنے والوں کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور انکی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے یہ سب کچھ علانیہ ہوتا ہے لیکن ان کے جملہ حرکات سے بالعموم مسامحت اور چشم پوشی برتی جاتی ہے کیونکہ وہ مسلک قومیت پرستی کے مدعی ہیں جنگ آزادی کے سپاہی ہیں میدانِ حریت کے غازی ہیں۔ ان ملحدانہ خیالات کے اسباب کچھ ہی ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خیالات کے اظہار میں اس قدر بے باکی اور جرأت کی بڑی وجہ ان کی قومیت پرستی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ قومیت پرستوں کا کیمپ ان کی مدافعت اور حفاظت کا ضامن ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک دہریہ خدا کا منکر مذہب کا دشمن۔ تہذیب اسلامی کا مضحکہ اڑانے والا۔ کانگریس کا صدر یعنی تمام قومیت پرست حضرات کا امیر ہو سکتا ہے تو پھر خدا کا انکار یا مذہب کی مخالفت جرم کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ سنتے ہیں کہ ایک بت پرست بھی جنگ آزادی میں شریک ہو کر "مجاہد فی سبیل اللہ" کہلایا جا سکتا ہے۔ تو اُن کے نزدیک اسلام کی کوئی ضرورت یا اہمیت ہی نہیں باقی رہتی۔ بالخصوص جبکہ اس فتویٰ کی سند بھی اُنہیں ایک بہت بڑے عالم دین سے۔ ان الفاظ میں ملجائے کہ

> مسٹر گاندھی نے (جنگ آزادی) میں اپنی جان اور مال دونوں لٹا دیا۔ پس وہ فی الحقیقت "مجاہد فی سبیل اللہ" ہیں اور بانفسھم[1] و باموالھم کے ہر دو مراحل جہاد مقدس سے گذر چکے ہیں۔ یہ (مسٹر گاندھی) حق و عدالت کا عجیب پیمانہ ہے
>
> (مضامین مولانا آزاد نمبر ۱۹ بحوالہ الداعی بابت شوال ۱۳۵۷ھ ص ۱۱)

کیا یہ سب کچھ اسلام کے مطابق ہو رہا ہے؟ اگر اسلام کے مطابق نہیں تو کیا "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے رُو سے اس الحاد و بیباکی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا سب سے مقدم فریضہ نہیں؟ اس کے روکنے کی سب سے عمدہ تدبیر یہی نہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت

---

[1] اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے۔ قرآن کریم نے یہ صفات مومنین مجاہدین کے لئے بتائے ہیں منہ

و اقتدار کو مستحکم کیا جائے۔ تاکہ ہر شخص اس جیتی جاگتی زندہ و درخشندہ قوم سے وابستہ رہنے میں عزت و وقار سرفرازی و سربلندی محسوس کرے۔ اور اس طرح ان کے معتقدات دین اور نظریات حیات کی عظمت نوجوانوں کے دلوں میں قائم ہو جائے۔ موجودہ انتشار و افتراق، تحزب و تشیع فرقہ بندی اور گروہ سازی کی وجہ سے قوم کی ہوا اکھڑ چکی ہے۔ قوائے عملیہ معطل ہو چکے ہیں۔ یک جہتی و یک نگہی کے فقدان سے فکر و نظر کی قوتیں بیکار ہو گئی ہیں۔ ان کے اعمال کوئی محسوس نتائج نہیں پیدا کرتے۔ قدم بڑھتے ہیں لیکن مسافت طے نہیں ہوتی۔ ہاتھ اٹھتے ہیں لیکن محمل لیلیٰ تک رسائی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جب قوم کی حالت یہ ہو جائے تو اس کی کوئی چیز وجہ جاذبیت نہیں ہو سکتی۔ "اپنے" اس سے اس لئے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ اس کے اندر کوئی کشش نہیں پاتے اور اپنی بیگانے اسے عزت کی نگاہوں سے اس لئے نہیں دیکھتے کہ من حیث القوم اس کی کوئی محکم اور پائدار ہستی ان کے سامنے نہیں ہوتی۔ لہذا ایسی قوم "ایں سو راندہ و آں سو راندہ" ریگ کے منتشر ذروں کی طرح ہوا کے ہر تیز جھونکے کے ساتھ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اڑتی پھرتی ہے۔ حضرات والا تبار! اٹھیے اور ریت کے ان بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹ کر ایک چٹان میں منتقل کر دیجئے تاکہ حوادث زمانہ کی اگر بڑی سے بڑی موج بھی اٹھے تو سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی | مزی چو خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

آخری گذارش

حضرات! اس قدر کھلی کھلی باتیں کرنے کی جرات کے لئے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں یہ جرات محض اس بنا پر ہے کہ وقت بہت نازک اور خطرات بہت قریب ہیں۔ کشتی قعر دریا میں ہے اور بہت سے خائن ہاتھ اس کے تختوں میں سوراخ کرنے میں مصروف ہیں۔ ایسے وقت میں اگر مسامحانہ اخلاق اور مداہنت و چشم پوشی سے کام لیا گیا تو انجام تباہی ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ روایتی پابندیوں اور رسمی تکلفات سے قطع نظر حق و صداقت کی جو راہ کتاب و سنت

نے ہمیں دکھائی ہے۔ اس کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کر دیں ان حقائق کو جو گذشتہ صفحات میں پیش خدمت کئے گئے ہیں۔ طلوع اسلام کے اوراق میں بار بار دُھرایا جا چکا ہے اور اپنے مسلک کے پیش نظر ہر دعویٰ کی دلیل کتاب وسنت سے پیش کی گئی ہے۔ اس وقت ان دلائل کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ کتاب وسنت کی نصوص خود آپ حضرات کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ سیاست میں مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کتاب وسنت کی روشنی میں ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ۔

(۱) کفر و ایمان کے معیار تقسیم کے مطابق مسلمان ایک الگ مستقل بالذات قوم ہیں۔ اس لئے وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ قومیت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔

(۲) مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور بربادی ان کی لامرکزیت کی وجہ سے ہے اس لئے ہنگامی جوش وخروش اور ہمسایہ قوم کی مناسبت سے قطع نظر مقدم یہ ہے کہ انہیں اجتماعی زندگی کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے اور جماعت کا مرکز قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ جماعت۔ اطاعت اور امارت ہی میں اسلامی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

(۳) قیام جماعت اور امارت کے ساتھ باہمی معاملات کے تصفیہ کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دو قوموں کی حیثیت سے باہمی معاہدہ کیا جائے اور متحدہ قومیت کے غیر اسلامی نظریہ کی بجائے اتحاد بین الاقوام کا صحیح مسلک اختیار کیا جائے

(۴) اس قسم کے معاہدہ کی رو سے یہ دونوں قومیں حصول آزادی کے مشترک مقصد کے لئے متحدہ محاذ قائم کریں۔

(۵) مسلمانوں کے لئے آزادی کا مفہوم قیام حکومت الٰہی ہے جو اس مقصد

کے حصول میں حائل ہوگا۔ وہ ان کا دشمن ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ حضرات ان اصولوں سے متفق ہوں گے۔ یہ اصول نئی چیز نہیں ہیں بلکہ وہی اصول ہیں جسے آپ نے اپنے ۱۹۲۶ء کے اجلاس کلکتہ میں ایک ریزولیشن میں بدیں الفاظ تسلیم کیا تھا۔

"چونکہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے۔ اس لئے مسلمان اپنی تنظیم کرکے اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں۔ البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارہ میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا جائے۔"

۱۹۲۶ء سے منافرت کی یہ خلیج برابر وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے۔ اور ایسا ہونا عین ارشاد خداوندی کے مطابق ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّكُمْ كَیْدُهُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ؕ" (سورہ آل عمران)

"اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنا ولی دوست (رازدار و معتمد) نہ بناؤ۔ وہ تمہاری تباہی میں کوئی کمی کرنے والے نہیں جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے انہیں وہ اچھی لگتی ہے۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہے۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو ہم نے (فہم و بصیرت کی) نشانیاں تم پر واضح کر دیں۔ دیکھو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تمہیں (ایک لمحہ کے لئے بھی) دوست نہیں رکھتے تم اللہ کی کتاب پر ایمان رکھنے والے ہو

جتنی کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ (لیکن) وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں۔ لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوشِ غضب میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں۔ (غور کرو ایسے لوگوں کو اپنا ہمراز بنانا اور قوم کے بھیدوں اور تدبیروں سے آگاہ کر دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے) تم اِن سے کہدو کہ (جاؤ) اور جوشِ غضب میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالو۔ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو انسان کے سینہ میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر تمہارے لئے کوئی بہتری کی صورت ہو جائے تو وہ انہیں بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو وہ بڑے ہی خوش ہوتے ہیں۔ (چنانچہ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی تدبیروں میں برابر لگے رہتے ہیں[1]) لیکن یاد رکھو اگر تم مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہے اور تقوے کی راہ اختیار کی تو اِن کا مکر و فریب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا جیسے کچھ بھی اِن کے کرتوت ہیں خدا کی قدرت انہیں گھیرے ہوئے ہے۔"

ہماری درخواست ہے کہ آپ اپنے مسلک کا اعلان واضح اور غیر مبہم الفاظ میں فرما کر ملّتِ اسلامیہ کے سامنے صحیح راہ عمل پیش کریں ہمیں یقین واثق ہے کہ آپ کا اعلان ہماری گذارشات کے پیشِ نظر جو مذکورۂ بالا آیاتِ مقدسہ اور آپ کے ۱۹۲۶ء کے ریزولیوشن کے عین مطابق ہیں۔ ہمارے بیان کردہ اصولوں پر مشتمل ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ آپکو اِن اصولوں سے اختلاف ہو تو ہماری مودبانہ استدعا ہے کہ آپ وجہ اختلاف کو کتاب و سنّت کی روشنی میں ملت پر واضح کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں

---

[1] تشریحی اضافہ از مولانا ابوالکلام۔ آزاد۔ منہ

آل انڈیا ریڈیو کی "ہندوستانی"

محمد اکرم خان۔ مدیر روزنامہ شمس ملتان

ہندوستان کی مشترکہ زبان کے مسئلہ پر یوں تو عرصہ دراز سے بحث چلی آرہی ہے۔ لیکن جب سے ملک میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے ہیں اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی اور اس کا کوئی نہ کوئی عملی حل تلاش کرنا نہایت ضروری سمجھا گیا ہے۔ ریڈیو کے باقی پروگراموں مثلاً تقریروں، کہانیوں، ڈراموں، نظموں وغیرہ میں تو مختلف زبانوں کے استعمال سے کسی حد تک ہر علاقے اور ہر طبقے کے لوگوں کی تشفی کی جا سکتی ہے لیکن سب سے بڑی مشکل خبروں کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں خبروں کے لئے یہ انتظام تھا کہ یہ دہلی اسٹیشن سے ہندوستانی[1] میں پشاور سے اردو میں اور بمبئی سے ہندی میں براڈکاسٹ ہوا کرتی تھیں۔ اس وقت بمبئی سے نشر ہونے والی خبریں کم از کم شمالی ہندوستان میں بڑی حد تک ناقابلِ فہم ہوتی تھیں اور دہلی اور پشاور سے خبروں کی تقریباً ایک ہی زبان ہوا کرتی تھی جو ہر جگہ بآسانی سمجھی جا سکتی تھی۔ یہ اس امر کا ایک عملی ثبوت تھا کہ ہندوستانی اور اردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں اور اس کے مقابلے میں ہندی ایک مختلف اور محدود زبان ہے۔

معلوم نہیں کہ اندرونی یا بیرونی کون کون سے اثرات کارفرما ہوئے کہ محکمہ آل انڈیا ریڈیو نے کچھ عرصہ کے بعد یہ انتظام بدل دیا اور دہلی، بمبئی اور پشاور کے علاوہ لاہور اور لکھنؤ کے اسٹیشنوں سے بھی خبروں کی زبان کا ایک ہی نام یعنی ہندوستانی رکھ دیا اگرچہ بمبئی اور

---

[1] ریڈیو اسٹیشن کے مطبوعہ پروگرام کے الفاظ ہیں۔

شمالی ہند کے اسٹیشنوں کی زبان کا فرق بدستور قائم رہا۔ خیر اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو چنداں اعتراض کی بات نہ تھی لیکن رفتہ رفتہ اس جماعت نے جو اردو یا ہندوستانی کو مٹا کر اسکی جگہ ہندی کو رواج دینے پر تلی ہوئی ہے، شور مچانا شروع کیا۔ اخبارات میں پروپاگنڈہ ہونے لگا اور اسمبلیوں میں بار بار سوال کئے گئے۔ نتیجہ یہ کہ ریڈیو کا نیا نیا محکمہ اس مخالفت کی تاب نہ لاسکا اور مروّجہ ہندوستانی زبان کو بگاڑ کر ایک نئی ہندوستانی زبان پیدا کرنے پر کمربستہ ہوگیا۔

اس نئی زبان ڈھالنے کا سب سے آسان طریقہ یہی سمجھ لیا گیا کہ ہندوستانی سے فارسی اور عربی کے لفظ نکال کر انکی جگہ سنسکرت یا ہندی کے لفظ بھرتی کئے جائیں۔ چنانچہ آخر کار نفسیاتی اصولوں کے مطابق نہایت تدریج کے ساتھ یہ عمل شروع کر دیا گیا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے سب سے پہلے "استقبال" کی جگہ "سواگت" کا لفظ پیش کیا گیا۔ اس نووارد کی یہ گت بنی کہ اب اس کا مفہوم ہی بالکل برعکس سمجھا جانے لگا ہے، گویا ہندوستانی زبان کی مرجیہ لغت میں ایک نئے لفظ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کے بعد شمال جنوب مشرق مغرب کی بجائے اتر دکھن، پورب پچھم استعمال ہونے لگے۔ الگ الگ تو یہ لفظ کچھ کام دیتے رہے لیکن جب شمال مغربی اور جنوب مشرقی کی جگہ اتر پچھمی دکھن پوربی کی ترکیبیں آنے لگیں تو مطلب خبط ہونے لگا یہاں تک کہ موسم کی خبریں بالکل معما بن کر رہ گئیں اور آخر چھوڑ دینی پڑیں بعد ازاں آہستہ آہستہ دیش، جنم بھومی، راجدھانی، اجاگر۔ جیسے لفظ داخل کئے گئے خیر ایسے لفظ بھی چنداں اجنبی نہ تھے لیکن گذشتہ ایک دو مہینے سے یکایک بہت سے غیر مانوس لفظوں کو اچھے خاصے ہندوستانی لفظوں کی جگہ دی جانے لگی ہے۔ عین اسی طرح جیسے کہ فلسطین میں عربوں کی جگہ یہودی آباد کئے جا رہے ہیں مثلاً پچھلے دنوں سے خبروں میں شانتی (امن) شکتی (طاقت) سمے (وقت) آگیا (اجازت) اتر (جواب) اچھا (مرضی)۔ منتری (وزیر) ادھیکار (اختیار)۔ آشا (امید)۔ سوچنا (اطلاع) جیسے لفظوں کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے۔

غالباً اپنی اِس روش کی تائید حاصل کرنے کے لئے پچھلے دنوں آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے چھ تقریریں براڈ کاسٹ کرائی گئیں جن کا عنوان تھا "ہندوستانی کیا ہے" اِن تقریروں کے لئے ڈاکٹر تاراچند۔ مولوی عبدالحق۔ بابو راجندر پرشاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور مسٹر آصف علی کو دعوت دی گئی۔ توقع تھی کہ یہ صاحبان زبان کے مسئلہ پر کسی نئے زاویہ سے روشنی ڈالیں گے اور محکمہ ریڈیو کی مشکلات کا کوئی عملی حل نکالیں گے لیکن افسوس کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ بہت سے اصحاب نے یہ تقریریں خود سن لی ہوں گی۔ اس وقت نہ ان تقریروں پر الگ الگ تبصرہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ان سب مسئلوں اور تجویزوں پر رائے زنی کا امکان جو ان تقریروں میں پیش کی گئیں البتہ مجموعی طور پر اِن تقریروں پر اظہارِ خیال فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اِن تقریروں میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں نظر آئی وہ یہ تھی کہ ہر مقرر نے تقریر کو آسان سے آسان اور سادہ سے سادہ بنانے کی انتہائی کوشش کی۔ جہاں تک ہو سکا عربی۔ فارسی۔ اور سنسکرت کے الفاظ سے پرہیز کیا اور پھر دعوے یہ کہ جو زبان میں بول رہا ہوں یہی ہندوستانی ہے حالانکہ سب تقریروں کی زبان میں صاف صاف فرق موجود تھا مثلاً مولوی عبدالحق صاحب کی زبان سادہ اور سلیس اردو یا ہندوستانی کا بہترین نمونہ تھی تو بابو راجندر پرشاد کی تقریر ایک ایسی زبان میں تھی جو نہ ہندی تھی اور نہ ہندوستانی۔ اِنہوں نے اپنا مطلب سمجھانے کی یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ ہر جگہ شد[1] اور لفظ سے اور وقت وغیرہ کی طرح دو دو لفظ اکٹھے استعمال کرتے رہے اس طریقے سے مفہوم تو ادا ہو گیا لیکن زبان کوئی بھی نہ رہی۔ پنڈت برجموہن کیفی اور ڈاکٹر

---

[1] یعنی جب وہ "شد" اور "وسے" جیسے الفاظ بولتے تھے تو انہیں خود احساس پیدا ہو جاتا تھا کہ سننے والے ان الفاظ کو سمجھ نہیں سکیں گے اِس لئے اِن کے ساتھ لفظ۔ اور وقت جیسے عام فہم الفاظ کا اضافہ کر دیتے تھے اِس لئے خود ظاہر ہے کہ مانوس الفاظ کونسے ہیں اور غیر مانوس کونسے۔

ڈاکٹر حسین خان صاحب کی تقریریں بہت کچھ ہم رنگ تھیں لیکن صاف صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کتنے تکلف کے ساتھ ہندوستانی کو ہندی کے قریب لے جانے کی کوشش کی گئی ہے عربی اور فارسی کے بہت سے عام لفظوں کو چن چن کر الگ کیا گیا اور ان کی جگہ جو لفظ رکھے گئے وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ ہم کو جبراً بھرتی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں رواج کی جگہ چلن اور مشکل کی جگہ کٹھن وغیرہ جیسے بے شمار لفظ ان کی پر تکلف کوشش کی غمازی کر رہے تھے لیکن "علامہ" کیفی کی زبان سے "سادھارن" کا لفظ سن کر تو واقعی تعجب ہوا۔ مسٹر آصف علی کی تقریر کا رنگ بھی یہی تھا مگر مناسب حدود سے بہت بڑھا ہوا۔ یقین ہے کہ انہیں اچانک کسی مجمع میں تقریر کرنے کے لئے کھڑا کر دیا جاتا تو وہ کبھی ایسی مصنوعی زبان استعمال نہ کرتے۔

مختصر لفظوں میں گویا ایک طرف سے تو ہندی زبان ہی کو ہندوستانی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور دوسری طرف سے محض رواداری کے طور پر ہندوستانی کو ہندی کے ہم آہنگ بنانے میں کوئی کمی نہ کی گئی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ گویا ہر صورت میں ہندی تحریک کی غیر محسوس طور پر عملی حمایت ہوتی رہی۔

یہ مشورہ دینے میں بھی کسی مقرر سے کوتاہی نہیں ہوئی کہ عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے بڑے بڑے لفظوں سے اجتناب کیا جائے۔ حالانکہ یہ مشورہ اتنا ہی بے معنی ہے۔ جتنا کہ یہ عام اور سطحی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جو ہندو صاحبان دراصل صرف عربی اور فارسی لفظ نکلوانا چاہتے ہیں وہ ساتھ سنسکرت کا یونہی اضافہ کر دیتے ہیں تاکہ فرقہ پرستی کا الزام نہ آئے اور اسی طرح جو مسلمان درحقیقت سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتے ہیں وہ عربی اور فارسی کو بھی محض برائے بیت شامل کر لیتے ہیں تاکہ آزاد خیالی اور رواداری کا سکہ بیٹھ جائے۔ ورنہ جھوٹی رواداری اور مذہبی تعصب سے ہٹ کر خالص ادبی اور لسانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس مشورہ کی

قلعی بہ آسانی کھل جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو یا ہندوستانی زبان کا ڈھانچہ سنسکرت ہی سے بنا ہے اور عربی۔ فارسی اور انگریزی کے لفظ اس کے محض گوشت پوست کے اجزا رہیں۔ گویا سنسکرت کے جتنے لفظوں کی گنجائش تھی وہ اپنی اصلی یا حسب ضرورت بدلی ہوئی صورت میں اردو کے اندر موجود ہیں۔ جہاں جہاں سنسکرت کے لفظوں سے کام نہیں چلا وہاں عربی۔ فارسی یا انگریزی کے مناسب لفظوں نے کمی پوری کر دی ہے یہ بیرونی الفاظ بالارادہ یا کسی خاص تحریک کے زیر اثر داخل نہیں کئے گئے بلکہ محض ضرورتاً خود بخود آئے ہیں۔ اب ان کو نکالنے کے کیا معنے؟ ضرورت تو صرف سنسکرت کے ان الفاظ کو خارج کرنے کی ہے جو ایک خاص تحریک کے ماتحت بلا ضرورت اور بغیر گنجائش کے زبردستی داخل کئے جا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں سنسکرت ایک بہت ہی پرانی زبان ہے جو اپنی زندگی پوری کر چکی ہے۔ اس وقت یہ کسی ملک تو کیا کسی جماعت کسی شہر اور غالباً کسی گھر میں بھی نہیں بولی جاتی۔ وہ اپنا عملی کام مدت ہوئی ختم کر چکی اور جو لفظ ہماری زبان کو دینے تھے دے چکی۔ اس کے برعکس عربی اور فارسی دونوں زندہ زبانیں ہیں اور ایک سے زیادہ ملکوں میں رائج ہیں۔ ان ملکوں میں ہندوستان کا ہر طرح میل جول اور تعلق قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ ان زبانوں کے لفظ خود بخود ہماری زبان میں شامل ہوتے رہیں گے اور ہوتے رہنے چاہئیں۔ لہذا سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ نکال دینے کے مشورے کے وقت عربی یا فارسی کا نام بھی ساتھ لے دینا محض زبردستی نہیں تو اور کیا ہے۔

ایک اور بات جس پر ان تقریروں میں اکثر زور دیا جاتا رہا یہ تھی کہ مشترک زبان وہ ہونی چاہیئے جو عام فہم ہو جسے ان پڑھ اور بالخصوص دیہات کے لوگ سمجھ سکیں۔ بظاہر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا غور کیا جائے تو یہ محض اس پر لطف غلط فہمی پر مبنی ہے کہ مشترک زبان کے معنی ہیں۔ عام زبان اور عام زبان سے مراد ہے عوام

کی زبان! کیا دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک پیش کیا جا سکتا ہے جہاں کی قومی اور ادبی زبان وہی ہو جو وہاں کے عوام کی زبان ہو؟ انگریزی ہی کی مثال لے لیجئے جو اس وقت دنیا کی سب سے وسیع سلطنت کی مشترکہ زبان ہے مگر امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ تو الگ رہے خود جزائر برطانیہ میں یکساں نہیں ہے۔ آئرلینڈ۔ سکاٹ لینڈ اور ویلز تو کیا خود انگلستان کے مختصر سے علاقے کے مختلف گوشوں میں بھی بول چال کی زبان مختلف ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود علم، ادب، تجارت، سیاست ہر مقصد کے لئے ایک معیاری زبان موجود ہے۔ ہندوستان میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہزار سالہ میل جول سے ایک مشترکہ زبان وجود میں آچکی ہے جو ایک ادبی معیار رکھتی ہے۔ اب ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ تعلیم کو عام کر کے عوام کو اس بلند معیار کی طرف لایا جائے نہ یہ کہ ادیبوں کو زبان کا بلند معیار چھوڑ کر عوام کی سطح پر آجانے کا مشورہ دیا جائے۔ مولانا الطاف حسین صاحب حالی اور پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار کی نثر۔ شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق اور منشی دیا شنکر صاحب نسیم کی نظم معیاری زبان کے بہترین نمونے ہیں۔ اگر اس زبان کے ہوتے ہوئے بھی ابھی کسی اور عام فہم زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کے کارناموں کو دریا برد کر دیا جائے اور دیوان وغیرہ کو مدرسوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کر کے گنواری زبان کو فروغ دیا جائے!

تقریروں کے سلسلے میں اصل سوال یعنی "ہندوستانی کیا ہے؟" کا جو جواب دیا گیا (بلکہ جو جوابات دیئے گئے) وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس ضمن میں تمام تقریروں کا نچوڑ کچھ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے:-

(۱) ہندوستانی وہ زبان ہے جو میں بول رہا ہوں۔

(۲) ہندوستانی وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

(۳) اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی لیکن دونوں کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی ہے۔

(۴) اردو سے عربی اور فارسی کے اور ہندی سے سنسکرت کے لفظ نکال دیئے جائیں تو حاصل ہندوستانی زبان ہوگی۔

(۵) ہندوستانی دراصل کسی زبان کا نام نہیں ہے۔ انگریزوں نے یونہی نام تراش کر رائج کر دیا۔

(۶) اردو اور ہندی زبانیں روز بروز ایک دوسری سے دور ہوتی جاتی ہیں اور ہندوستان کی مشترک زبان کوئی نہیں۔

(۷) ہندوستانی زبان اس وقت کوئی نہیں۔ بنیادی انگریزی کی طرح اردو اور ہندی کے مشترک الفاظ جمع کر کے ایک نئی زبان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ہیں اِس ایک سوال کے کم از کم سات جواب۔ اِن جوابات سے اگر کوئی صاحب کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں تو ان کو اب ریڈیو اسٹیشن سے ساتویں تقریر براڈ کاسٹ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اِن چھ تقریروں کا حاصل تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ع

شُد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

بہر حال جہاں تک زبان کے مسئلہ کا تعلق ہے یہ بے نتیجہ بحث اِسی طرح جاری رہے گی لیکن جہاں تک آل انڈیا ریڈیو کی عملی مشکلات کا سوال ہے اس کا حل چنداں دشوار نہیں۔ محکمہ کو چاہیئے کہ اردو ہندی کی ہنگامی تحریکوں سے بالکل متاثر نہ ہو۔ کسی نئی زبان گھڑنے کا خیال ترک کر دے اور موجودہ زبان کو محض مترجموں کے رحم پر چھوڑنے کے بجائے آج کل کی مسموم ہوا سے پہلے کی کسی مستند لغت مثلاً ڈاکٹر فالنؔ کی ہندوستانی ڈکشنری کو زبان کا معیار مقرر کر لے۔ اس میں سنسکرت ہندی

عربی۔ فارسی وغیرہ کے تقریباً سب ایسے لفظ موجود ہیں جو ہندوستانی میں کھپ چکے ہیں اور جن کو عام طور پر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ڈکشنری کے مطابق ترجمہ ہوتا ہے تو کسی جماعت کو جائز وجہ شکایت نہیں ہو سکتی۔

محکمہ اس تجویز پر کم از کم ایک سال تک عمل کر دیکھے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو تو بہتر ورنہ آخری صورت پھر یہ ہونی چاہیئے کہ پشاور۔ لاہور۔ دہلی اور لکھنؤ سے اردو یا ہندوستانی میں خبریں براڈکاسٹ کی جائیں اور بمبئی سے ہندی میں۔ اور اگر بالفرض دہلی اور لکھنؤ سے بھی ہندی کے لئے تقاضا ہو تو یہاں سے اردو کے وقت کے علاوہ ہندی خبروں کے لئے کچھ وقت مقرر کر دیا جائے تاکہ جو لوگ اردو میں سننا چاہیں وہ اردو میں اور جو ہندی میں چاہیں وہ ہندی میں سن لیا کریں بہرصورت موجودہ حالت میں ہندوستانی کے پردے میں جس طرح زبان کو بگاڑا جا رہا ہے وہ نہایت تکلیف دہ ہے۔ اور ذوقِ لطیف کے لئے ناقابلِ برداشت۔

(نوٹ)

اہمیت کے لحاظ سے "علمار کرام کی خدمت میں عرضداشت" "ہندوستان کا تہذیبی مستقبل" "خطبہ صدارت" علیحدہ علیحدہ طبع کئے گئے ہیں ہر ایک کی قیمت ایک ایک آنہ رکھی گئی ہے۔
دفتر سے طلب کیجئے

مینیجر

طلوعِ اسلام

یعنی

ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کا ماہوار مجلّہ۔ جو اسلام کے جماعتی نصب العین کے مطابق مئی ۱۹۳۸ء سے شائع ہو رہا ہے۔

طلوعِ اسلام

کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ تمام اُمّتِ اسلامیہ کا مشترکہ پرچہ ہے اس کا

نصب العین

مسلمانوں میں جماعتی زندگی کا احیا، قرآن کریم کے حقائق و علوم کی اشاعت، سیاسیاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کی صحیح اور سچی رہنمائی ہے۔

جو لوگ!

مغربی علوم و فنون سے مرعوب ہو چکے ہیں اُن کو یہ رسالہ بتائے گا کہ دنیا خواہ کتنی ہی آگے نکل جائے قرآن کریم ہر زمانہ میں اُس سے آگے ہی نظر آئے گا۔

بلند پایہ مضامین!

کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اکثر مضامین کتابی شکل میں کئی کئی بار طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ وہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کا سچا رہنما، بہترین مشیر اور ان پر غور و فکر کی راہیں کشادہ کرنیوالا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ صہ/

نمونہ مفت طلب فرما کر خریداری کا فیصلہ کیجئے! منیجر طلوعِ اسلام بلیماران دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

مطبوعات دائرہ طلوع اسلام

الحمدللہ کہ دائرہ طلوع اسلام کی مطبوعات نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ واردھا اسکیم کے تین ایڈیشن نکل چکے۔ گفتگوئے مصالحت دوبارہ طبع کرائی گئی اسی طرح دیگر رسائل بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہے ہیں۔ ان مطبوعات کی خصوصیت یہ ہے کہ انکا نفع کسی فرد واحد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اسکو طلوع اسلام کی ترقی اور دیگر تالیفات پر صرف کیا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرت

مشہور متکلم اسلام مولانا غلام احمد صاحب پرویز نے اس رسالہ میں صحیح اسلامی معاشرتی زندگی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالنا چاہتا ہے اگر آپ اپنی زندگی کا نصب العین معلوم کرکے اپنی سیرت کی تشکیل قرآن کریم کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور ملاحظہ کیجیے قیمت ۸ محصولڈاک ۱ر

واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان

(از جناب رازی) اس کا چوتھا ایڈیشن بھی جو کئی ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ختم ہورہا ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اس کی مانگ جاری ہے۔

قیمت مع محصول ۱۰ر

سوراجی اسلام

(از جناب رازی) سیاسیات ہند میں تہلکہ ڈالنے والی کتاب جنے کانگرسی لیڈروں کے عزائم کو بے نقاب کردیا ہے، الہلال کے دور اول میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کیا تھے۔ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے کانگرسیوں کا متحدہ محاذ قیمت فی نسخہ ۲ر محصول ۰

زبان کا مسئلہ

(از جناب رازی۔ اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط کے تھا بتایا گیا ہے کہ کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو کس طرح اردو کو تباہ کرکے ہندی اور سنسکرت کو ہندوستان کی قومی زبان بنا رہے ہیں۔ کانگرسی حکومتوں کے سرکاری ریکارڈ سے بتایا گیا ہے کہ ہندو وزیر اردو کو برباد کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کررہے ہیں قیمت ۱ر علاوہ محصول

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi. Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office, Delhi.